مرتبہ

بادشاہ حسین - فیض محمد صدیقی

ناشر

ادارۂ اشاعتِ اردو حیدرآباد (دکن)

قیمت دو روپیہ بارہ آنہ

پہلا اڈیشن - ایک ہزار

اگست ۱۹۴۳ء

مطبوعہ

اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز و پبلشرز

حیدرآباد (دکن)

دیباچہ ۳

اردو زبان کی عمومیت

جس زبان میں یہ کتاب پیش کی جا رہی ہے اُس کو خواہ ہندوستانی کہا جائے خواہ اُردو بہرحال یہ وہی زبان ہے جو ہندوستان میں عام طور پر اگر لکھی اور پڑھی نہیں جاتی تو سمجھی اور بولی ضرور جاتی ہے۔ اِس حقیقت کی تائید وہ حضرات یقیناً کریں گے جنھیں ہندوستان کے طول و عرض میں سفر کرنے کا موقع ملا ہے۔ یہ کہتے وقت ہمارے پیش نظر رسم خط کا جھگڑا نہیں بلکہ صرف بولی کا سوال ہے۔ اُردو خواہ دیوناگری رسم خط میں لکھی جائے خواہ نستعلیق میں خواہ عربی یا فارسی ٹائپ میں ہندوستان کی نہ صرف عام زبان ہے بلکہ مُلک کی دوسری زبانوں کی بہ نسبت علمی زبان ہونے کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو اصلاً کوئی خاص زبان نہیں بلکہ مختلف زبانوں سے ترکیب پاکر عام بول چال کے لئے رائج ہوئی۔ لسانیات کے ماہر جب اُس کا تجزیہ کرتے ہیں تو انھیں اُس میں مختلف زبانوں کے ریزے صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ کوئی لفظ عربی کا ہے تو کوئی فارسی کا کوئی سنسکرت کا ہے تو کوئی بھاشا کوئی بنگلہ کا ہے تو کوئی پنجابی کا۔ کوئی مرہٹی کا ہے تو کوئی تلنگی کا کوئی ترکی کا ہے تو کوئی انگریزی کا۔ کوئی گجراتی کا ہے تو کوئی تامل کا۔ غرض یہ کہ متعدد زبانوں کے الفاظ اِس میں موجود ہیں اور اُس کے ساتھ ہی مختلف زبانوں کی علمی صلاحیت بھی اس میں یکجا ہیں۔

ایسی صورت میں اس کو کسی ایک فرقہ کی، کسی ایک قوم کی یا کسی ایک مقام کی زبان سمجھنا نادرست ہے۔ اس کی تشکیل ہندوستان میں ہوئی، رواج یہیں ہوا، یہیں لکھی پڑھی اور بولی سمجھی جانے لگی۔ مسلمان اِس کو ساتھ نہیں لائے بلکہ ہندوستان آنے سے پہلے اُن کے ذہن میں اِس کا خاکہ تک نہ تھا۔ اُن کی رواداری

دیکھئے کہ اُنھوں نے صرف اپنی ہی زبان کو رواج دینے پر زور نہیں دیا بلکہ مقامی زبانوں اور اپنی زبان کے میل جول سے ایک ایسا مرکب تیار کرنے کی کوشش کی جو مقبول عام ہوسکے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اصل مقصد قبولیت عام تھا اور اسی لئے مقامی زبانوں سے اشتراک کیا گیا اور یقیناً اسی وجہ سے آج اُردو سارے ہندوستان کے گوشے گوشے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

زبان اُردو کی تاریخ اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ابتدا میں اور نہ اوائل میں کسی خادم زبان یا مصلح زبان کو اس کا خیال تھا کہ اُردو ہندوستان کی عام زبان نہیں بلکہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ صرف ایک ہی فرقہ میں مقبول ہوتی اور اس کا سرمایہ اسی مخصوص فرقہ سے متعلق ہوتا۔ لیکن چونکہ ایسا نہیں ہے اور یہ حقیقت ہر شخص جانتا ہے اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ صدیوں تک یہ تنگ نظری مفقود تھی اور ہندوستان کے سارے فرقے مشترکہ طور پر اس زبان کو اپنی زبان سمجھکر اس کی ترقی میں کوشاں تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو یقین مانئے کہ یہ زبان جو دوسرے زبانوں کے مقابلہ میں کم عمر اور کم مایہ تھی اتنی جلدی ترقی کی منزلیں طے نہ کرتی۔

لسانیات کو مذہبات سے متعلق کردینا انصاف کے خلاف ہے۔ مذہب کا تعلق زبان سے نہیں بلکہ دل سے ہے۔ نیت اور ایقان مذہب کے اہم اجزا ہیں۔ زبان بے چاری کو ان دونوں سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اسی وجہ سے زبانیں مذہبی گہوارہ میں نہیں بلکہ مقامی ثقافت کی آغوش میں پرورش پاتیں اور پروان چڑھتی ہیں۔

اُردو زبان کی علمی صلاحیتیں

کسی زبان کی ترقی صرف اُسی پر منحصر نہیں ہوتی کہ اُس کے بولنے والوں کی تعداد زیادہ ہے بلکہ اس کے ادبی ذخیرہ اور اس کی اشاعت پر بھی ہوتی ہے اور اس سے بڑھکر یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کی علمی صلاحیت کتنی زیادہ ہے کیونکہ زبان جب تک علمی نہ ہو اور اُس میں مختلف علوم و فنون کا ذخیرہ موجود نہو اُس کو ایک بلند پایۂ اور ترقی یافتہ زبان نہیں کہا جاتا۔

اُردو کی مقبولیت کا ذکر تو اُوپر تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے اَب ذرا لگے ہاتھوں اس کی علمی صلاحیتوں کا حال بھی سُن لیجئے۔ آج سے رُبع صدی پہلے اُردو زبان کا سرمایہ اس کا ادب تھا جس میں بیشتر حصہ شاعری اور وہ بھی غزل کا تھا۔ علمی کتابوں کا ذخیرہ بہت کم تھا جو اُس کو ایک علمی زبان کی حیثیت سے نمایاں کرنے کے لئے ناکافی تھا لیکن سلطان العلوم کی سرپرستی میں حیدرآباد دکن میں جب سے کہ جامعہ عثمانیہ کی داغ بیل پڑی اُردو زبان کو ایک خاص علمی حیثیت حاصل ہوئی۔ یہاں طریقہ تعلیم سے بحث کرنے کا موقع نہیں البتہ یہ تو سب کو معلوم ہی ہے کہ مادری زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دے کر سب سے

پہلا جرات آمیز قدم سلطان العلوم کی سرپرستی میں جامعہ عثمانیہ میں اُٹھایا گیا اور اب کئی سال کے تجربوں کے بعد یہ اُصول تسلیم کر لیا گیا اور ملک کے گوشے گوشے سے اس کو پسند کیا جانے لگا حتیٰ کہ ہندوستان کی بعض جامعات نے جامعہ عثمانیہ کی تقلید کا تصفیہ کیا اور یقین ہے کہ مستقبل قریب میں یہی طریقہ تعلیم مقبول خاص و عام ہوگا۔

دار الترجمہ کے قیام نے اِس میدان عمل کو وسیع سے وسیع تر کیا اور تمام علوم و فنون کی اِصطلاحیں وضع ہوئیں اور متعدد کتابیں ہر علم و فن پر دھڑا دھڑ ترجمہ ہونے لگیں اور اُردو زبان کا علمی سرمایہ اتنا بڑھا کہ اس زبان کی علمی صلاحیتیں مسلم ہوگئیں۔ اب اُردو میں بفضلہ ہر علم و فن کی تعلیم نہ صرف ممکن ہے بلکہ آسان ہوگئی۔ اَدق سے اَدق علوم جن کی اِصطلاحوں کو اُردو کا جامہ پہنانا اور جن کو اُردو میں تعلیم دینا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن سمجھا جاتا تھا اَب معمولی سی بات ہو کر رہ گئی۔

اُردو میں حوالہ جاتی کتابوں کی کمی

اُردو ذریعہ تعلیم بھی ہو چکی اور اس میں علوم و فنون کا ذخیرہ بھی منتقل ہوگیا لیکن ایک کسر ابھی رہ گئی تھی اور وہ حوالہ جاتی کتابوں کی کمی تھی۔ ترقی یافتہ اور علمی زبانوں میں اِس قسم کی کتابوں کی کثرت ہے اور جب تک ایسا لٹریچر زبان میں موجود نہو اس کی اِشاعت محدود رہتی ہے۔ علوم و فنون کے درس و تدریس کا معاملہ جامعہ عثمانیہ کی حد تک محدود تھا اور ایسے اُردو داں جنھوں نے جامعہ میں تعلیم نہیں پائی اور نہ پا سکنے کے مواقع رکھتے ہیں اور انگریزی یا دوسری زبانوں میں دستگاہ نہیں رکھتے کہ ان زبانوں کی حوالہ جاتی اور عام علمی کتابوں سے اِستفادہ کر سکیں علوم و فنون سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے تھے۔ ہر ترقی یافتہ زبان کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف جامعاتی زبان قرار پائے بلکہ عوام کو بھی علوم و فنون کی عام معلومات بہم پہنچائے تاکہ اس ترقی یافتہ زمانہ میں وہ علوم و فنون کی بڑھتی ہوئے رَو کے ساتھ زمانہ کا پوری طرح ساتھ دے سکیں۔

اسی حوالہ کی اور عام تعلیم دینی والی کتابیں "اِنسائیکلوپیڈیا" Encyclopaedia اور "بک آف نالج" Book of knowledge ہیں۔ اول الذکر دقیق علمی و فنی حوالوں کا بے پایاں ذخیرہ رکھتی ہے اور آخر الذکر عوام کو علوم و فنون سے ضروری حد تک آگاہ کراتی ہے اور اس کا طرز بیان عام پسند ہوتا ہے۔ "اِنسائیکلوپیڈیا" اعلیٰ درجہ کے طالب علموں اور تحقیق کرنے والوں کے لئے ضروری ہوتی ہے اور "بک آف نالج" اوسط درجہ کے طالبعلموں اور ایسے عوام کی کتاب ہوتی ہے جو اپنے معلومات وسیع کرنا اور بہت سے ایسے مسائل سے واقف ہونا چاہتے ہیں جن سے اِس دنیا میں اُن کو دوچار ہونا پڑتا ہے اور جن کے بغیر وہ کامیاب زندگی نہیں گذار سکتے۔

ظاہر ہے کہ ایسی دو کتابوں کے بغیر اُردو زبان کو علمی وقار حاصل نہیں ہو سکتا۔ اِس کمی کو اُردو کے

بہی خواہوں نے محسوس کیا اور اُردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب واشاعت کا اہم اور وسیع کام کا بیڑا ملک کے ہردلعزیز اور اُردو کے مشہور خدمت گذار "ادارۂ ادبیات اُردو" نے اُٹھایا۔ ملک کے اکابر علما، اور ماہرین فنون اس کا ہاتھ بٹا رہے ہیں ابتدائی کام ہوچکا ہے اور توقع ہے کہ اس سال کے آخر تک دس جلدوں کے منجملہ پہلی جلد منظر عام پر آجائے گی۔ اب دوسری اہم ضرورت "بک آف نالج" کی باقی رہ جاتی ہے۔ اس کا خیال حسن اتفاق سے ہمیں اُردو انسائیکلوپیڈیا کے معتمدین ہی کو آج سے چھ سات سال پہلے ہوا۔

کاروانِ علم کا ابتدائی خاکہ انگریزی زبان کی "بک آف نالج" کے سوا مغربی زبانوں کی اس قسم کی کتابوں کی چھان بین کی گئی اور اُن کی ترتیب اور ان کے مواد کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا گیا۔ ملک کی ضروریات اور زبان کی صلاحیتوں پر غور کیا گیا۔ یہ کام بڑا مشکل تھا کیونکہ ممالک غیر اور ہمارے ملک میں اس خصوص میں بہت فرق ہے۔ ہمارے ہاں علوم و فنون سے استفادہ کا شوق کم اور جہالت زیادہ ہے۔ اس کے سوا ہمارے عامی کا معیار بھی نسبتاً پست ہے۔ ملک کی خاص ضرورتوں کا جائزہ لینا اور بھی مشکل تر تھا ذہنیتوں اور رجحانات میں کثیر اختلافات کی وجہ سے ضروریات کا صحیح تعین دشوار تھا۔ ان سب باتوں سے تفصیلی طور پر واقف ہوکر طریقہ کار معین کرنے اور ساری کتاب کا خاکہ تیار کرنے کے لئے ہم نے ضروری سمجھا کہ ہندوستان کے بعض وسیع تجربہ رکھنے والے ماہرین تعلیم اور عوام کی نفسیات سے واقف کار حضرات سے مشورہ کیا جائے۔ اکثروں سے مراسلت اور بعضوں سے طویل گفتگوئیں ہوئیں۔ اگر اُن کے نتایج یہاں بیان کئے جائیں تو کتاب کا ایک مستقل باب ہو جائیگا پھر بھی بہت ہی مختصر ساذکر کئی وجوہ سے ضروری ہے تفصیلات کے علاوہ شخصیتوں کے ناموں کے اظہار سے بھی مصلحتاً احتراز کیا جائے گا ورنہ بعض ناظروں کو اس دیباچہ پر اشتہار کا شبہ ہونے لگے گا۔ ممکن ہے کہ آئندہ کسی موقع پر یہ تفصیلات پیش کی جائیں۔

بہرحال یہ جاننا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اس کتاب کے خاکے پر رائے زنی کرنے والوں کے دو گروہ تھے ایک وہ لوگ جو اس قسم کے کام کو اُردو میں ناممکن سمجھتے تھے۔ وجوہ انھوں نے بیان نہیں کئے۔ لیکن ہم نے اندازہ کیا کہ یا تو وہ اُردو زبان کی صلاحیتوں سے واقف نہیں یا پھر ان کی نظر ایک طرف اشاعت کے لئے زرکثیر کے خرچ پر ہوگی اور دوسری طرف عوام کی ناقدری پر۔ لیکن ان سب کے انداز تحریر سے یہ صاف واضح تھا کہ وہ بھی اس قسم کی کتاب کی ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب نے لکھا "اگر آپ یہ کام کرلیں تو میں سمجھوں گا کہ آپ نے معجزہ کردکھایا۔ ایک اور نے تحریر فرمایا "جوانی میں کوئی کام ناممکن نظر نہیں آتا لیکن کچھ ایسا کر دکھائیے کہ ہم بوڑھے بھی جوان ہو جائیں" حالانکہ ان مولانا صاحب نے خود اتنا کام کیا ہے کہ جن کو دیکھ دیکھ کر ہماری ہمتیں جوان ہوئی ہیں۔ ایک اور صاحب نے جن کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے قانون دانوں میں ہوتا ہے اور جن کی اُردو دوستی زبان زد خاص و عام ہے تحریر فرمایا۔ "حیدرآباد جانے سے پہلے آپ نے ازراہ کرم کاروان علم کے تفصیلی خاکہ

سے مجھے مطلع فرمایا تھا۔ اس کے بعد حیدرآباد کے چار روزہ قیام میں آپ سے گفتگوئیں بھی ہوئیں اور اب پھر آپ نے کام کی رفتار سے مطلع فرمایا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں مجھے اس کام سے گہری دلچسپی ہے اور میری آرزو ہے کہ کاش یہ کاروان منزل مقصود تک پہنچ جائے۔" اس گروہ نے ہمیں قدرے مایوس کیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے کام کا دوسرا رخ بھی معلوم ہوگیا اور ہم زیادہ محتاط ہوگئے۔

دوسرا گروہ اُن اصحاب کا تھا جن کے آگے جب اس کتاب کا ذکر کیا جاتا تو اُن کی باچھیں کانوں تک کھل جاتیں اور ایسے مسرور ہوتے جیسے ہم نے اُن کے فائدے کی کوئی بڑی بات بتا دی ہو۔ ایک صاحب نے جو ہندوستان کی سب سے اونچی عدالت کے رکن ہونے کے علاوہ علم دوستی اور اردو نوازی میں خاص شہرت رکھتے تھے اس قدر دلچسپی کا اظہار فرمایا کہ دوسروں کو رشک اور ہم کو حیرت ہونے لگی۔ پہلا خط کاروان علم کا خاکہ ملاحظہ فرمانے کے بعد جو مرحوم نے لکھا اس میں ایک یہ جملہ بھی تھا " اب مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ اردو زبان کے دن پھرے ہیں اور اسکا کاروان ترقی کی اعلیٰ منزلوں کی طرف جا رہا ہے۔" خاکے کو انھوں نے تنقیدی نظروں سے دیکھا اور تفصیلی مشورے دیئے۔ ہر ہر قدم پر دلچسپی کا اظہار کیا اور جب وہ سہ روزہ قیام کے لئے حیدرآباد آئے تو اُس وقت حسن اتفاق سے کچھ صفحات چھپ کر تیار رکھے تھے اور جب انھوں نے اُن کو دیکھا تو ہم سے اس طرح بغلگیر ہوئے جیسے کہ ہم نے اُن کا اپنا کوئی کام کر دیا ہو۔ ایک دوسرے بلند پایہ مصنف، مترجم اور محقق نے جو اس وقت بھی انگلستان میں بیٹھے مشرقی علوم و فنون کو انگریزی داں دنیا سے متعارف کرا رہے ہیں اس وقت اتفاقاً حیدرآباد ہی میں موجود تھے چھپے ہوئے صفحات دیکھکر فرمایا کہ " یہ کام حیدرآباد ہی میں ہو سکتا ہے اور جواں ہمت اور جواں سال مصنف ہیں اس کو انجام دے سکتے ہیں۔ گو کہ میں بوڑھا ہوں لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ ولایت جانا چھوڑ کر اس کام کی تکمیل کے لئے اپنی خدمات پیش کروں"

دیباچہ میں اس قسم کی باتوں کی تفصیلات کا موقع نہیں ہوتا ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ کام کس طرح شروع کیا گیا اور اس کی ترتیب کیونکر کی گئی۔ موافق اور مخالف مشوروں کو سامنے رکھکر خاکہ مرتب کیا گیا اور پھر خاکہ کو تنقید و تبصرہ کے لئے باریک بینوں کے ہاں بھیجا گیا اور ضروری تبدیلیوں کے بعد کتاب کے عنوانوں کی فہرست مرتب کی گئی جو آپ کو کہیں اور نظر آئے گی۔ طریقہ کار یہ معین کیا گیا کہ ایک ایک عنوان کو چھ چھ حصوں میں تقسیم کیا جائے اور ہر جلد میں ایک عنوان کا ایک حصہ پیش کیا جائے جس طرح سے کہ انگریزی کی " بک آف نالج " یا اسی قسم کی فرانسیسی کتابوں میں ہے تاکہ ہر جلد میں تنوع جاتی رہے اور معلومات بتدریج پڑھنے والے کو حاصل ہوتے جائیں کہ یہی طالب علم کی نفسیات ہے۔ گویا اس طرح ہم نے کتاب کو چھ جلدوں میں تقسیم کیا اور ہر جلد میں ایک ایک حصہ ہر عنوان کے پیش کرنے کا طے کیا۔

مواد کے طے کرنے کے بعد زبان کا سوال تھا لیکن اس میں دو رائیں نہ تھیں اور سب کی ایک ہی خواہش تھی کہ زبان عام فہم ہو۔ البتہ کتاب کو مصور کرنے کے لئے بڑی دقتیں اٹھانی پڑیں لیتھو کے ساتھ بلاک کی تصویریں نہیں چھپ سکتیں اور اگر چھپ بھی سکتی تھی تو دو دفعہ چھاپنا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ مضمون طبع ہوا اور دوسری دفعہ

تصویر طبع ہو۔ لیتھو پر کتاب کی شایان شان تصویریں چھپنے کی کسی کو توقع نہ تھی کیونکہ یہ کام اس پیمانہ پر کبھی بھی نہیں کیا گیا تھا اور کوئی سابقہ تجربہ موجود نہ تھا۔ ہم نے کئی تجربے کر کے اس دشواری کو دور کیا اور اب جو تصویریں آپ کو اس کتاب میں ملیں گی خواہ وہ نقشے ہی کیوں نہ ہوں سب کی سب لیتھو پر چھپی ہوئی ہیں۔ کتابت و طباعت کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کتاب آپ کے سامنے ہے۔

دفعتاً کام رک گیا

عین اُس وقت جبکہ کتاب اپنی ابتدائی مراحل سے عمدگی کے ساتھ گذر چکی تھی کئی جلدوں کا مواد جمع تھا اور ایک جلد مرتب تھی۔ طباعت کا کام بھی جاری تھا اور سوا سو کے قریب صفحات چھپ چکے تھے کام کو روکنا پڑا۔ اس کے کئی وجوہ ہوئے مختصر یہ کہ کام رُکا اور عارضی طور پر چند مہینوں کے لئے لیکن بدقسمتی نے آگھیرا اور مہینوں کی جگہ سال ہوا اور پھر ایک سال ختم ہو کر دوسرا سال بھی ختم ہوا۔ کوئی صورت اشاعت کی موافق ہی نہ ہوئی بلکہ اور الجھنیں بڑھتی ہی گئیں۔ ایسے میں جنگ شروع ہوئی۔ کاغذ کی گرانی بڑھتے بڑھتے انتہا کو پہنچنے لگی۔ رہی سہی امید بھی یاس سے بدل گئی۔ ایک طرف تو ہماری دن رات کی کئی سال کی محنتیں اکارت ہو رہی تھیں اور دوسری طرف عوام کو علوم و فنون سے واقف کرانے اور اردو کو علمی زبان بنانے کا شوق رائیگاں جا رہا تھا۔

مطبوعہ کتاب کی اشاعت

ایسے میں ادارۂ اشاعت اردو قائم ہوا اور اُسی نے یہ بات سوجھائی کہ جتنا حصہ چھپ چکا ہے اُسی کو کیوں نہ شائع کر دیا جائے بات معقول تھی اور اس کا تعاون حاصل تھا ویسے بھی ایک مطبوعہ کتاب کو ڈال رکھنے کا کوئی مقصد نظر نہ آتا تھا اس لئے یہ طے پایا کہ چونکہ اس میں پوری کتاب کے نصف کے قریب عنوانات آچکے ہیں اس لئے اس کو پہلی جلد کے پہلے حصہ کے نام سے فی الوقت شائع کر دیا جائے اور دوسرا حصہ پہلی جلد کو مکمل کرنے کے لئے بہت جلد پیش کیا جائے۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ وہ تمام اصحاب جن کو ایک عرصہ سے اس کتاب کی اشاعت کا انتظار تھا اور ان میں بہت سے جو مایوس ہو چکے تھے اب اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

ناظرین براہ کرم اس ضروری اور اہم بات کا بطور خاص خیال رکھیں کہ ایک مطبوعہ کتاب کی اس وقت اشاعت کی جا رہی ہے اور جو کچھ مواد اس میں پیش کیا گیا ہے وہ اس جنگ کے شروع ہونے سے دو تین سال قبل کا ہے جس میں اس وقت کافی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ دوسرے اڈیشن میں کتاب کی معلومات کو مطابق حالات کر دیا جائے گا۔ فقط

فیض محمد و سید بادشاہ حسین

۲۹ مئی ۱۹۴۳ء

کرۂ ارض

کرۂ ارض جس پر ہم رہتے سہتے ہیں جس پر اونچے اونچے پہاڑ، بے پایاں سمندر، لق و دق جنگل اور عجیب و غریب مخلوق آباد ہے، فضاء بسیط میں اس کی حیثیت ایک ذرہ سے زیادہ نہیں۔ فضاء میں ایسے بے شمار چھوٹے بڑے اجسام ہیں، جن میں سے بعض کو سیارے اور بعض کو ستارے کہتے ہیں۔ ان میں اکثر کو ہم خالی آنکھ سے بھی دیکھ سکتے ہیں لیکن جو بہت دور ہیں، وہ دکھائی نہیں دیتے حالانکہ جسامت کے اعتبار سے وہ ہمارے سورج سے بھی کئی لاکھ گنا زیادہ ہیں۔ اُن کی دُوری کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ سورج کو ہم سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کے فاصلے پر واقع ہے لیکن اس کی روشنی ہم تک چند منٹوں میں پہنچ جاتی ہے اور ان اجسام کی روشنی کو ہم تک پہنچنے کے لئے سینکڑوں سال لگتے ہیں (روشنی ایک ثانیہ میں ۱۸۶۰۰۰ میل کا فاصلہ طے کرتی ہے) اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ ستارے ہم سے کتنی دوری پر واقع ہیں۔ فضاء میں ایسے لاکھوں کروڑوں ستارے ہیں اور اکثر ستاروں کے درمیان کروڑوں میل کا فاصلہ ہے اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فضا کس قدر پھیلی ہوئی ہے۔ فضاء میں سیارے اور ستارے ہی نہیں ہیں بلکہ جلتے ہوئے مادّوں کے عظیم الشان بادل بھی ہیں جنھیں سحابیے کہتے ہیں۔ یہ بہت بڑے ہوتے ہیں۔ ان میں ہماری زمین کی حیثیت بحرِ اوقیانوس میں ایک کنکر کی سی ہے۔ یہ تمام اجسام فضاء بسیط میں ایک نامعلوم رفتار کے ساتھ گردش لگا رہے ہیں۔ ہمارا کرۂ ارض بھی قدرت کے اس جلوس کے ہم جلو ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھئے کہ ہماری زمین بہت ہی ہیچ ہے اور اس کی کوئی وقعت نہیں۔ ہاں جسامت کے اعتبار سے حقیر ضرور ہے لیکن یہ بھی صانع قدرت کا ایک کرشمہ ہے جس پر ہماری زندگی کا دارومدار ہے، اسی لئے ہمیں چاہیئے کہ اس کے اور اس کے ہمسایوں کے متعلق معلومات حاصل کریں۔

ہم کہتے ہیں فضاء خالی ہے۔ یہ غلط ہے۔ فضاء خالی نہیں بلکہ ایک غیر مرئی مادّہ سے لبریز ہے جسے ایتھر کہتے ہیں۔ ایتھر ہر جگہ اور ہر مقام پر موجود ہے۔ اسی ایتھر کی

بدولت سورج کی حرارت اور روشنی ہم تک پہنچتی ہے اور اسی کی وجہ سے ہم سورج اور دوسرے ستاروں کو دیکھ سکتے ہیں۔

ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ فضاء میں لاکھوں میل قطر کے منور بادل ہوتے ہیں جنھیں سحابیہ کہتے ہیں۔ ماہران علم ہیئت نے دوربینوں اور طیف پیماؤں کی مدد سے یہ معلوم کیا ہے کہ سحابیے بالخصوص دو گیسوں ہائیڈروجن اور ہیلیم پر مشتمل ہوتے ہیں یہ گیسیں بہت ہلکی ہوتی ہیں اور کیمیا دانوں نے یہ معلوم کیا ہے کہ ان دو گیسوں کے جوہروں کی باہمی ترکیب سے دیگر عناصر پیدا ہوتے ہیں۔ گیسی حالت میں یہ بادل بہت لطیف ہوتے ہیں لیکن جیسے جیسے عناصر کی ترکیب عمل میں آتی ہے، وہ سکڑتے اور سکڑ کر کثیف تر اور گرم ہوتے جاتے ہیں یہانتک کہ وہ ہمارے سورج کی طرح ایک سورج بن جاتے ہیں۔ پھر اس سورج کے ایک خاص مقام سے حرارت بہت تیزی کے ساتھ خارج ہوتی ہے اور سورج ٹھنڈا ہونے لگتا ہے۔ جب ٹھنڈا ہوتا ہے تو کثیف عناصر پیدا ہونے لگتے ہیں۔

فضاء بسیط میں کئی سورج اس نوبت کو پہنچ چکے ہیں اور طیف پیما کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ ان میں کئی عناصر موجود ہیں جن میں لوہا بھی شامل ہے۔ سحابیوں سے سے سورج اسی طرح بنتے ہیں اور ہمارا سورج بھی اسی طرح پیدا ہوا۔

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ حرارت کے خارج ہونے سے جب سورج سکڑتے ہیں تو کچھ حصے ان سے ٹوٹ کر علیحدہ ہو جاتے اور ان کے اطراف چکر لگانے لگتے ہیں۔ ہماری زمین بھی ہمارے سورج کا ایک ایسا ہی ٹکڑا ہے

کتنی عجیب ، کہ ہماری زمین کبھی فضاء بسیط میں غیر مرئی ایتھر کے عظیم الشان سمندر کے اندر ہائیڈروجن اور ہیلیم گیس کا مجموعہ تھی لیکن اب اس پر سر بلند پہاڑ، طوفان خیز سمندر حیوانات، نباتات سبھی موجود ہیں۔ صانع قدرت کا یہ ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔

ابتدا میں ہماری زمین جلتی ہوئی گیسوں اور پگھلی ہوئی دھاتوں کا ایک گولہ تھی۔ جب یہ سرد ہو کر سکڑنے لگی تو اس کے اوپر ایک سخت مادہ کی تہ جم گئی اور یہ عجیب بات ہے کہ اس تہ میں زیادہ تر وہی اشیاء موجود ہیں جو حیوانی اور نباتی زندگی کے لئے ضروری ہیں مثلاً لوہا، چونا، گندک، سوڈیم، پٹاشیم وغیرہ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جب زمین سکڑنے لگی تو اس کی تہ پھٹ کر زبردست آتش فشاں نمودار ہوئے۔ ان سے بھاپ نکلی جس کی تکثیف سے پانی اور کاربن ڈائی آکسائیڈ (وہی گیس جو سوڈے کی بوتلوں میں بھری جاتی ہے) پیدا ہوئے اس طرح سے زمین پر دریا، سمندر اور کرۂ ہوائی پیدا ہوئے۔ کروڑہا سال تک زمین اسی حالت میں رہی بالآخر پانی کے اثر سے رفتہ رفتہ اس کا پرت مٹی اور کیچڑ میں تبدیل ہونے لگا۔

سورج نے اپنے لخت جگر کو اپنے سے الگ تو کر دیا لیکن اپنی روشنی سے اسے زندگی بخشی اور اب تک اس کی پرورش کرتا چلا آرہا ہے۔ چنانچہ زمین پر کی تمام زندہ اشیاء کا دارومدار سورج ہی کی روشنی پر ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ زمین کے پرت اور اس کے کرۂ ہوائی میں جو کچھ بھی مادے تھے ان سے زندہ اشیاء کی تعمیر کس طرح ہوئی؟ کوئی شخص اس کا قطعی جواب دے نہیں سکتا۔ البتہ اس کی توجیہہ کچھ اس طرح سے کی جاسکتی ہے

ہم جانتے ہیں کہ زمین پر پانی تو تھا۔ اس میں بہت سی چیزیں حل شدہ تھیں جن میں کاربن ڈائی آکسائیڈ بھی شامل ہے۔

یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سورج کی روشنی کی بعض شعاعیں جب اس طرح کے محلول پر پڑتی ہیں تو ایک زہریلی شئے تیار ہوتی ہے جسے فارمل ڈی ہائیڈ Formaldehyde کہتے ہیں

اس زہریلی شئے سے سورج کی دوسری شعاعیں نشاستہ تیار کرتی ہیں۔ نشاستہ کا زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور یہ ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ سورج سبز پودوں میں پانی اور کاربن ڈائی آکسائیڈ سے نشاستہ تیار کرتا ہے حیوان نشاستہ استعمال کرتے اور اس مرکب میں سورج کی جو توانائی ہوتی ہے اسی پر تمام زندگی کا دارومدار ہے۔ تمام زندہ اجسام کے ریشے عمل انہضام کے ذریعہ اسی سے بنتے ہیں۔ اس طرح سورج کی کرشمہ سازیوں سے حیات کی بنا پڑی۔

حیات کا آغاز بس کچھ اس طرح سے ہوا لیکن حیات انسانی، جیسا کہ آج ہم دیکھتے ہیں، ایک لخت عالم وجود میں نہیں آئی بلکہ اسے مختلف ادوار سے گذرنا پڑا جنکی تفصیل یہ ہے:۔

برفانی دور۔ حشراتی دور۔ زحافی دور، پستانی دور اور انسانی دور۔

زمین کے ہمسایہ

سورج جب سکڑنے لگا تو اس سے صرف زمین ہی ایک ٹکڑا علیحدہ نہیں ہوا بلکہ ایسے متعدد ٹکڑے علیحدہ ہو کر فضا میں منتشر ہو گئے۔ ان میں سے جو ہمیں معلوم ہیں، ان کے نام یہ ہیں:۔

عطارد۔ زہرہ۔ زمین۔ مریخ۔ مشتری۔ زحل۔ یورانیس پنچون۔

ان اجسام کو سیارے کہتے ہیں اس لئے کہ یہ سورج کے اطراف گردش لگاتے ہیں ان کی جسامت مختلف ہے اور یہ سورج سے مختلف فاصلوں پر واقع ہیں۔ یہ سب سورج کے پیچھے ہیں۔ سورج اور ان سب سیاروں کو ملاکر سورج کا خاندان یا **نظام شمسی** کہتے ہیں۔ سہولت کی خاطر ہم نے سیاروں کی جسامت اور سورج سے ان کے فاصلوں کو جدول کی صورت میں درج کر دیا ہے۔

ان سیاروں کے علاوہ ہمارا سب سے قریبی ہمسایہ چاند ہے۔ جس وقت زمین سرد ہو رہی تھی اس وقت اس کا ایک ٹکڑا اس سے علیحدہ ہو گیا۔ یہ ٹکڑا چاند ہے یہ چونکہ ہم سے بہت قریب ہے اس لئے ہمیں بہت عزیز ہے۔ آج کل ماہران علم ہیئت چاند کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنے میں کوشاں ہیں۔ بہت کچھ حالات معلوم ہو چکے ہیں اور رفتہ رفتہ ان میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ دیگر سیاروں میں سے بعض کے بھی چاند ہیں۔ ان کی تعداد ایک سے لیکر نو تک ہے جو جدول سے ظاہر ہے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ فضا میں بے شمار سیارے اور ستارے موجود ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کس طرح سے قائم ہیں؟ اس کا جواب اس وقت ملا جب ایک انگریز سائنس داں سر اسحاق نیوٹن نے دنیا کے آگے تجاذب کا مسئلہ پیش کیا۔ اس نے بتلایا کہ مادی اجسام میں آپس میں کشش کرنے کی قابلیت ہوتی ہے اور اس کشش کی قابلیت کا انحصار شئے کے

سورج اور سیاروں کے مداروں کا خاکہ۔ سیدھے ہاتھ کی جانب سیاروں کی جسامت اور سورج سے ان کے فواصل درج ہیں

شمارہ	نام سیارگان	قطر (میلوں میں)	سورج سے فاصلہ (میلوں میں)	مدت گردش	ان کے چاند
۱	عطارد	۲۷۶۵	۳۵،۹۸۷،۰۰۰	۸ روز	—
۲	زہرہ	۷۸۲۶	۶۷۲۴۵۰۰۰	۲۲۵ روز	—
۳	زمین	۷۹۱۸	۹۲۹۶۵۰۰۰	۳۶۵ روز	۱
۴	مریخ	۴۳۵۲	۱۴۱۶۵۰۰۰۰	۶۸۷ روز	۲
۵	مشتری	۹۰۱۹۰	۴۸۳۶۷۸۰۰۰	۱۲ سال	۹
۶	زحل	۷۶۴۷۰	۸۸۶۷۷۹۰۰۰	۳۰ سال	۱۰
۷	یورانیس	۳۴۹۰۰	۱۷۸۲۰۰۰۰۰۰	۸۴ سال	۴
۸	نپچون	۳۲۹۰۰	۲۸۰۰۰۰۰۰۰۰	۱۶۵ سال	۱

مادہ اور اشیاء کے باہمی فاصلوں پر ہے۔ اس طرح کی کشش تمام اجرام فلکی میں پائی جاتی ہے اور اسی کشش کی بدولت سب اپنی اپنی جگہوں پر موجود ہیں۔ اگر یہ کشش نہ ہوتی تو فضاء میں ہر لحظہ اور ہر آن ایک قیامت برپا رہتی اور فضا کیا ہوتی، سیاروں، ستاروں اور سحابیوں کا ایک دنگل ہوتا۔

سورج نظامِ شمسی کا مرکز ہے اور سیارے اس کے اطراف گردش لگا رہے ہیں۔

زمین کی گولائی اور حرکت

زمین ایک گول سیارہ ہے لیکن ربر کے گولہ کی طرح گول نہیں بلکہ نارنگی کی طرح گول، یعنی دونوں سروں پر کچھ چپٹی سی ہے ان چپٹے سروں کو زمین کے قطب کہتے ہیں۔ ایک شمالی اور دوسرا جنوبی قطب کہلاتا ہے۔ اکثر لوگ زمین کی گولائی کے قائل نہیں حالانکہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ اس حقیقت کا شاہد ہے۔ جب سمندر میں جہاز ساحل کی طرف آتا ہے تو پہلے اس کے مستول دکھائی دیتے ہیں اور بتدریج نیچے کا حصہ دکھائی دینے لگتا ہے اور جب قریب آ جاتا ہے تو پورا دکھائی دیتا ہے۔ اگر زمین چپٹی ہوتی تو جہاز پہلی نظر میں پورے کا پورا نظر آتا۔ زمین ہمیں چپٹی اس لئے نظر آتی ہے کہ ہم اس کے بہت تھوڑے حصے کو دیکھتے ہیں اگر فٹ بال پر ایک کاغذ رکھا جائے جس میں دوانی کے برابر سوراخ ہو تو اتنا حصہ ہمیں چپٹا نظر آئے گا حالانکہ فٹ بال گول ہے یہاں ہم اس کے تھوڑے سے حصے کو دیکھ رہے ہیں اس لئے وہ چپٹا نظر

آرہا ہے۔ یہی حال زمین کا ہے۔ اس کے علاوہ بعض سیاحوں نے معلوم کیا کہ کسی مقام سے نکلکر ایک ہی سمت میں سفر کرنے سے وہ پھر اسی مقام پر واپس آ گئے۔ اگر زمین چپٹی ہوتی تو یہ بات نہ ہوتی۔

زمین کا محیط ۲۵۰۰۰ میل ہے۔

ہم نے اُوپر تبلایا ہے کہ زمین، دوسرے سیاروں کی طرح سورج کے اطراف گردش کرتی ہیں لیکن کیا وہ صرف سورج کے اطراف گردش کرتی ہے یا اس کی اور بھی کوئی حرکت ہے؟ اس حرکت کے علاوہ زمین خود ایک لٹو کی طرح اپنے محور (وہ خیالی خط جو زمین کے قطبین کو ملاتا ہے) پر گھومتی ہے اس کے علاوہ پورا نظام شمسی ایک نامعلوم رفتار کے ساتھ فضا رکے اندر ایتھر کے سمندر میں گردش لگا رہا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم زمین کی مختلف قسم کی حرکتوں پر روشنی ڈالیں یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ زمین اگر حرکت کرتی ہے تو پھر اس کا احساس کیوں نہیں ہوتا؟ اس کے ساتھ ہی یہ خیال ہوتا ہے کہ سورج تو روزآنہ مشرق سے نکلکر مغرب کی طرف حرکت کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن اسے ہم ساکن کہتے ہیں اور زمین کو متحرک کیوں؟ ایک معمولی مثال آپ کے اس شک کو دور کردیگی۔ سورج کو ایک ریل گاڑی تصور کیجئے جو اسٹیشن پر کھڑی ہے اور زمین کو جس پر ہم کھڑے ہیں ایک دوسری ریل گاڑی فرض کیجئے جو پہلی ساکن گاڑی کے بازو سے گذر رہی ہے۔ اس وقت آپ کو اپنی گاڑی ساکن اور ساکن گاڑی متحرک نظر آئیگی۔ اسی طرح ہم ریل گاڑی میں سے بازو کے درخت اور پہاڑوں کو دیکھیں تو وہ حرکت کرتے ہوئے نظر آئینگے۔ یہی حال سورج اور زمین کا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کی حرکت کا احساس ہمیں اس وقت ہوتا ہے جبکہ کوئی دوسری چیز مقابلہ کے لئے موجود ہو۔ اگر کشتی میں یا تیز رفتار کم جھکولے دینے والی گاڑی میں آنکھ بند کرکے بیٹھیں تو یہ تبلانا مشکل ہے کہ آیا وہ چل رہی ہے یا ساکن ہے۔ حرکت کا احساس اس وقت ہوگا جبکہ ہم آنکھ کھول کر دیکھیں۔ تیسری چیز یہ کہ زمین اس قدر ہمواری کے ساتھ گھوم رہی ہے کہ ہمیں ایک جھٹکا بھی نہیں لگتا۔

اب ذرا غور کیجئے کہ زمین کی اس حرکت سے ساکنان زمین کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ زمین سورج کے سامنے ایک لٹو کی طرح اپنے محور پر گھوم رہی ہے اس طرح اس کے تمام حصے باری باری سے سورج کے سامنے آتے جاتے ہیں سامنے والے حصوں میں دن ہوتا ہے اور باقی حصوں میں رات۔ دن اور رات بس اسی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ اگر زمین اس طرح کی حرکت نہ کرتی تو رات دن پیدا نہ ہوتے اور دنیا کا ایک حصہ بالکل تاریک اور دوسرا روشن رہتا۔ اسی کے ساتھ ایک اور بات بھی قابل لحاظ ہے۔ وہ یہ کہ

جس حصہ میں دن ہوتا ہے، سورج کا فاصلہ اس حصے کے تمام مقامات سے یکساں نہیں ہوتا بلکہ پہلے زیادہ ہوتا ہے، پھر کم اور پھر زیادہ۔ صبح، دوپہر اور شام۔ قدرت کے اس انتظام سے ہمیں دن کے تمام حصوں میں یکساں گرمی نہیں پہنچتی بلکہ بتدریج بڑھتی اور گھٹتی ہے۔ اگر زمین گول نہ ہوتی تو یہ بات نہ ہوتی۔

زمین اپنے محور کے گرد ۲۴ گھنٹوں میں گھوم جاتی ہے۔

اب ہم زمین کی دوسری حرکت پر غور کریں گے۔ زمین سورج کے اطراف ایک خاص بیضوی خط پر گردش کرتی ہے۔ کبھی وہ سورج سے قریب ہوتی ہے اور کبھی دور۔ یہ گردش ۳۶۵ دن میں ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ زمین سورج کے اطراف گردش لگاتے وقت لٹو کی طرح علی التوائم نہیں رہتی بلکہ کسیقدر ترچھی رہتی ہے۔ زمین کا اس طرح ترچھا ہونا بہت ضروری ہے

میں شعاعیں اتنی سیدھی نہیں پڑتیں جہاں موسم سرما ہوتا ہے جب زمین اس کے مخالف مقام پر آتی ہے تو حالات بالکل الٹ جاتے ہیں اس طرح جب زمین کے نصف کرۂ شمالی میں گرما ہوتا ہے تو نصف کرۂ جنوبی میں سرما ہوتا ہے۔

زمین کی اندرونی حالت

ہم جانتے ہیں کہ زمین ایک بہت بڑا گولا ہے اس کا قطر ۸۰۰۰ میل ہے۔ اس کے اوپر ایک سخت پرت ہے جس میں مختلف قسم کی مادی اشیا موجود ہیں۔ زمین کا یہ پرت بمقابل اس کے قطر کے بہت پتلا ہے۔ اس کے اندر حرارت کا ایک زبردست خزانہ ہے۔ ہم قطعی طور پر کہہ نہیں سکتے کہ یہ حصہ ٹھوس ہے یا مائع یا گیس۔

زمین پر مختلف عناصر پائے جاتے ہیں، سونا، چاندی پارہ، سوڈیم وغیرہ۔ حال ہی میں ایک نیا عنصر دریافت

گرما میں سرما میں

کیونکہ موسم اسی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ سال کے ایک حصہ میں زمین کے شمالی نصف حصہ پر شعاعیں سیدھی پڑتی ہیں جس سے گرما کا موسم ہوتا ہے اور دوسرے حصہ

ہوا ہے جس کا نام ریڈیم ہے۔ یہ عنصر عجیب وغریب خواص کا مالک ہے۔ اس کی تحقیق کے بعد زمین کی اندرونی حرارت سے متعلق ہماری بہت ساری گتھیاں سلجھ گئیں۔

زمین کا اوپری پرت دو طرح سے حرارت حاصل کرتا ہے۔ ایک تو سورج سے اور دوسرے زمین کے اندر سے۔ دن میں زمین سورج سے حرارت حاصل کرتی اور رات کو ضائع کر دیتی ہے۔ اس طرح زمین کا نصف حصہ حرارت جذب کرتا اور دوسرا نصف خارج کرتا ہے۔ زمین کی اندرونی حرارت زمین کے پرت کو گرم کرتی اور اس سے ہو کر فضا میں چلی جاتی اور ضائع ہو جاتی ہے۔ اس طرح سے زمین گویا حرارت کو کھو رہی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ زمین حرارت کو کھو نہیں رہی ہے بلکہ حاصل کر رہی ہے۔ کس طرح ؟ ریڈیم عنصر زمین کی حرارت کو برقرار رکھتا ہے۔ اس عنصر میں عجیب بات یہی ہے کہ وہ حرارت اور نور کا ایک خزانہ ہے۔ دوسرے عناصر تاوقتیکہ گرم نہ کئے جائیں۔ حرارت سے بے نیاز رہتے ہیں لیکن ریڈیم خود سے حرارت پیدا کرتا اور خرچ کرتا ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس ایک روپیہ ہو اور وہ دو آنے روز خرچتا جائے اور اسے روز آنہ دو آنے کی آمدنی ہو تو اس کی جیب پر کچھ بار نہ پڑے گا۔ وہ خرچ کرتا بھی ہے تو اس کی جیب بھری ہے یہی حال ریڈیم کا ہے۔ وہ حرارت دیتا ہے اور اس کی حرارت میں کمی نہیں ہوتی۔ کوئلہ کی طرح ریڈیم سورج کی حرارت کا ممنون نہیں بلکہ بذاتہ حرارت کا مالک ہے۔ گو قشر ارض میں ریڈیم کی بہتات نہیں تاہم کم و بیش ہر جگہ اس کے شائبے پائے جاتے ہیں لیکن یہی مقدار بہت کافی ہے اور حرارت کے روزینہ نقصان کی ایک حد تک تلافی کرتی ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ زمین کے اندرونی حصہ میں ریڈیم کی کافی مقدار ہو گی جس کے باعث وہ زمین کو ایک عرصہ دراز سے گرم رکھے ہوئے ہے۔ سورج میں اس عنصر کی موجودگی کا بہت زیادہ امکان ہے۔ بہر حال زمین کی اندرونی حالت کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے وہ قیاس ہے، ورنہ اس کے اندر جا کر تو کوئی حقیقی حال معلوم نہیں کر سکتا۔

آگ اور پانی سے دنیا کی تعمیر

ہمیں معلوم ہے کہ قشر ارض ٹھوس مادہ پر مشتمل ہے۔ اس میں گرانائٹ اور بیسالٹ کی چٹانیں ہیں۔ اگر ان کی بجائے دھاتیں ہوتیں تو حیات کا وجود ناممکن ہوتا۔ گرانائیٹ اور بیسالٹ میں لوہا، میگنیشیم، سلیکن، فاسفورس، چونا، سوڈیم اور پٹاشیم موجود ہیں اور یہ اشیا حیات کے لئے مفید ہیں، پانی، کاربن ڈائی آکسائیڈ اور نائٹروجن کا وجود بھی مصلحت سے خالی نہیں۔ بہرحال زمین کی خمیر میں وہی اشیا داخل ہیں جو حیات کے موئید ہیں۔

لیکن اگر کرۂ ارض گرانائیٹ اور بیسالٹ پر ہی مشتمل ہوتا تو بڑی مشکل ہوتی۔ اس کا مٹی کی حالت میں تبدیل ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جب زمین ٹھنڈی ہو کر سکڑنے لگی تو بعض حصوں میں ابھار ہو گیا اور بعض حصے دب گئے اس طرح پہاڑوں کے سلسلے اور سمندر وجود میں آئے آتش فشاں پہاڑوں سے گرم راکھ اور مختلف قسم کی گیسیں نکلکر فضا میں پھیل گئیں اور اندر سے جو بھاپ نکلی اس نے بادل کی شکل اختیار کی اس بھاپ کی پھاڑوں پر تکثیف ہوئی اور دریا و سمندر پیدا ہوئے۔ پھر ہوا اور پانی کی متحدہ طاقت سے گرانائیٹ اور بیسالٹ کے پہاڑ پسنے لگے۔ لاکھوں برس تک یہ عمل جاری رہا۔ آتش فشاں پہاڑ پھوٹتے تھے، زلزلوں کی گرم بازاری تھی، پہاڑ

سمندر اور سمندر پہاڑ بنتے جاتے تھے۔ کسی زمانہ میں کوہ ہمالیہ
کسی سمندر کی تہ ہوگا اور بحر اوقیانوس کسی براعظم کی سطح۔ اسکا
ثبوت ہمیں اس طرح ملتا ہے کہ اکثر پہاڑ بالکلیہ سمندری خول
سے ترکیب پائے ہوئے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ کسی
زمانہ میں حیدرآباد اور دہلی کسی سمندر کی تہ ہوں!!

جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا ارضی تغیرات میں کمی
واقع ہوگئی اور زلزلوں اور آتش فشاں پہاڑوں میں پہلے
کا سا زور و شور نہیں رہا بلکہ دوسری قوتیں کرۂ ارض کی
شکل و صورت بدلنے لگیں اُن میں آگ، پانی، کہر، ہوا وغیرہ
کو خاص دخل ہے۔

اس وقت ہمارا کرہ بڑی حد تک ہمیں مکمل حالت
میں نظر آتا ہے۔ اس پر پہاڑ، دریا، سمندر اور جنگل سب
کچھ ہیں۔ گرانائیٹ اور بیسالٹ پس کر مٹی بن گئے ہیں جس پر
ننھے ننھے پودوں سے لیکر بڑے بڑے درخت
اُگتے ہیں اور حیوانی زندگی نہایت درجہ ہمواری کے ساتھ
بسر ہو رہی ہے۔ لیکن قدرت کی مشین ابھی کارفرما ہے
سمندر موجیں مار رہا ہے، ہوائیں تندی کے ساتھ چل
رہی ہیں، پہاڑ صحراؤں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ زلزلے
ابھی ختم نہیں ہوئے، آتش فشاں پہاڑ اب بھی کام کر رہے
ہیں۔ کرۂ زمین گو بظاہر سکون کی حالت میں ہے لیکن
ابھی اس میں بے چینی باقی ہے۔ ہمارے پاس اس
بات کا یقین کرنے کے لئے کافی وجوہ موجود ہیں کہ ایک
دن وہ آنے والا ہے جبکہ کوہ ہمالیہ کی سب سے بلند چوٹی پر
سے جہاز گذرینگے اور بحیرۂ ہند کی سطح پر شہر آباد ہونگے۔
قلب زمین ابھی متحرک ہے! لیکن یہ تبدیلی سال دو سال میں
نہیں بلکہ اس کے لئے لاکھوں صدیاں درکار ہیں۔ اسکے
ساتھ ہی ہم یہ بھی توقع کرسکتے ہیں کہ ایک دن سورج بجھ
جائیگا اور ہمارا کرہ بالکل ٹھنڈا ہوکر منجمد ہوا سے محصور
گھومنے لگے گا۔ بہرحال یہ زمانہ ابھی بہت دور ہے۔

سورج اور ہواؤں کی کاریگریاں

قدرت کا کارخانہ مادی اشیاء کے باہمی تعاون اور
اتحاد سے چل رہا ہے۔ سورج اور ہواؤں میں خاص اتحاد
ہے اور ان کے زیر اثر دنیا کے بہت سے کام چل رہے
ہیں۔ قدرت کے یہ دو کارکن کبھی خاموش نہیں رہتے۔
بلکہ کچھ نہ کچھ کیا کرتے ہیں۔ سورج کی گرمی کے اثر سے سطح
زمین پر کی ہوا گرم ہوکر ہلکی ہوتی اور اوپر جاتی ہے اور
سرد ہوا اس کی جگہ لیتی ہے اس طرح سے ہوائیں چلتی
ہیں۔ اب سورج کی گرمی سے سمندر کا پانی بخارات بنکر بڑی
بڑی بلندیوں تک اُٹھتا اور بادل کی شکل اختیار کرتا ہے۔
ہوائیں ان بادلوں کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک
لیجاتی ہیں۔ اور مختلف مقامات پر پانی کی صورت میں
برساتی ہیں۔ بارش کا یہ پانی ندی نالوں اور دریاؤں کی صورت
میں سطح زمین پر سے بہتا اور گرانائیٹ اور بیسالٹ کی چٹانوں
کو گھس کر مٹی میں تبدیل کرتا ہے۔ جب دریا زور سے
بہتے ہیں، تو بڑی بڑی سخت چٹانیں گھس جاتی ہیں اور
ان کی بلندی گھٹ جاتی ہے۔ بارش کا پانی جب زور
سے بہتا ہے تو زمین کو کاٹتا جاتا ہے اور بعض صورتوں
میں کناروں کی بلندی کئی فٹ تک پہنچ جاتی ہے اور
جب وہ وادیوں میں سے گذرتا ہے تو کناروں کو چھانٹ
کر میدان بنا دیتا ہے۔ اس طرح سے بارش کے پانی کے
زیر اثر بلند مقامات میدان اور نشیبی حصے بلند ہوجاتے ہیں

اس طرح سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کا بھی چٹانوں اور پہاڑوں کی تعمیر و تخریب میں بہت کچھ حصہ ہے۔ یہ کرۂ ہوا سے بارش کے پانی میں حل ہوتی ہے اور کیمیائی طور پر چونے، سنگ مرمر اور دیگر اشیاء پر اثر کرتی ہے۔ ان کے علاوہ کہر اور برف بھی چٹانوں کو چکنا چور کر کے مٹی بناتے ہیں۔ اس طرح سے زمین کا سخت پرت رفتہ رفتہ مٹی کی چٹانوں اور مٹی سے محیط ہو گیا۔ مٹی زندگی کے لئے بعض ضروری اشیاء مہیا کرنے کے واسطے ناگزیر ہے۔ یہ سب سورج اور ہواؤں کی کاریگری ہے!

چٹانوں کی مدد سے دنیا کی تاریخ کا علم

ماہران طبقات الارض نے مختلف قسم کی چٹانوں کا جب گہری نظر سے مطالعہ کیا تو انہیں ان میں تاریخ عالم کے اوراق بکھرے ہوئے نظر آئے جن سے انہوں نے عالم کی تاریخ مدون کی۔

چٹانیں عام طور پر دو قسم کی ہوتی ہیں۔ (۱) آبی چٹانیں اور (۲) آتشی چٹانیں وہ چٹانیں جو سمندر کی مٹی سے بنی ہیں انہیں آبی چٹانیں کہتے ہیں اور وہ چٹانیں جو اس طرح نہیں بنیں بلکہ اصلی ہیں، آتشی چٹانیں کہلاتی ہیں۔ یہ چٹانیں دنیا کی کل چٹانوں کا دسواں حصہ ہیں اور یہ مسلسل پانی کے عمل سے مٹی میں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

آبی چٹانیں دنیا کی تاریخ کا پتہ دیتی ہیں۔ جب ماہران طبقات الارض نے ان کا مطالعہ شروع کیا تو انہیں ان میں حیوانی اور نباتی زندگی کے آثار ملے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ چٹانوں کے ہر طبقہ میں حیات کے آثار مختلف ہیں۔ اس طرح تہ بہ تہ مطالعہ کر کے دنیا کی تاریخ کی تدوین کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جو تہ سب سے اوپر ہے اسے جدید نہ سمجھنا چاہیے کیونکہ اس امر کا قطعی امکان ہے کہ مرور زمانہ کے باعث وہ گھٹ گئی ہو اور نہ معلوم اس کے اوپر کی اور کتنی تہیں نذر آب و باد ہوئیں اس مشکل کو دور کرنے کے لئے ماہران طبقات الارض نے چند اصول بنا لئے ہیں جن سے وہ آسانی سے چٹانی تہوں کی حیوانی اور نباتی باقیات سے دنیا کے ارتقائی منازل کا پتہ چلا سکتے ہیں۔

اس اصول کے مطابق دنیا کی تاریخ مرتب کی گئی ہے جو چار ابواب پر مشتمل ہے:۔

پہلا باب بہت ہی قدیم زندگی سے متعلق ہے اسے Palaezoic دور کہتے ہیں۔ یہ بالکل ابتدائی زمانہ ہے۔ اس میں اور پانچ تدریجی دور شامل ہیں۔

اس تصویر میں کرۂ ارض
کی اس تاریخ کا خاکہ دیا گیا ہے
جب سے کہ اس پر حیات کا آغاز
ہوا۔ اگر کرۂ ارض کی عمر کو ہم ۲۴
گھنٹوں کے برابر تصور کریں تو
پہلے بارہ گھنٹے اس کے ایسے
گذرے جبکہ اس پر حیات کے
آثار نابود تھے۔ بعد کے بارہ
گھنٹوں میں حیات کا نمو ہوا۔
یہ گویا دنیا کا دن ہے، اس سے
پہلے کا زمانہ رات کے مماثل تھا۔
اس طرح ہم دنیا کی تاریخ کو دو
حصوں — دن اور رات — میں
تقسیم کرسکتے ہیں۔ ہر گھنٹہ ۳۰ لاکھ
برس کی نمائندگی کرتا ہے۔

اس نقشے میں زندہ مخلوق کی
صرف پیدائش کا حوالہ ہے اگرچہ
کہ اس کے بعد کے دوروں میں بھی
ان کا وجود تھا لیکن یہاں صرف
ان کی ابتدا کو پیش کیا گیا ہے۔
پہلے دو گھنٹوں میں ننھے ننھے
سمندری کیڑے پیدا ہوئے اور
پہلی مرتبہ خونی مچھلیاں عالم وجود
میں آئیں۔ ۲ اور ۳ کے درمیان جل
بچھوؤں کی نشو و نما ہوئی اور
... کا ظہور ہوا اور پہلے پرندے پیدا ہوئے جن کے اپنے اسلاف کی طرح بڑے بڑے دانت اور زبردست جبڑے تھے۔ نیز ۱۰ اور
گیارہ کے قریب بندر پیدا ہوئے اور آخری نصف گھنٹہ میں انسان نمودار ہوا۔

۳ اور ۴ کے درمیان ریڑھ کی ہڈی
والی مچھلیاں پیدا ہوئیں۔ ریڑھ کی
ہڈی والے جانوروں کی ابتدا بس
یہیں سے ہوئی
۴ اور ۶ کے درمیان مچھلیاں
بہت بڑی اور طاقتور ہوگئیں
اور بڑے بڑے کھیکڑوں سے
جنگ کرنے لگیں۔ دوسری مخلوق
پر ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں
کی یہ پہلی فتح تھی۔
۶ سے ۸ تک بڑے بڑے تناور
درخت پیدا ہوئے ہماری کوئلہ کی
بڑی بڑی کانیں اسی نباتات کی
باقیات ہیں۔ خشکی پر درختوں کی
اتنی افراط تھی کہ بحری جانوروں
کا دل بھی خشکی کی طرف مائل ہوا۔
یہ جل تھلیوں کا دور تھا۔ اب ہاتھ
اور پیر کا بھی ظہور ہوا۔
۸ تا ۹ بحری گرگٹوں کا دور تھا،
۹ اور ۱۰ کے درمیان زحافی جانوروں
کی نشو و نما ہوئی بڑے بڑے گرگٹ
اور اڑنے والے اژدھے پیدا ہوئے
اس کے بعد ہی پرندے پیدا ہوئے
۱۱ اور ۱۲ کے درمیان عجیب قسم کے
دہشت ناک رینگنے والے جانوروں
۱۱ کے درمیان پستانی جانور بھی پیدا ہوئے۔ ۱۱ تا ۱۲ حال کا دور ہے جس کے آخری حصہ میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ساڑھے

Cambrian Ordovician Silurian Devonian Carboniferous

دوسرا باب قدیم زندگی سے متعلق ہے۔ اسے Mesozoic دور کہتے ہیں۔ اس میں Triassic Jurassic Cretaceous ادوار شامل ہیں۔

تیسرا باب۔ جدید زندگی سے متعلق ہے، اسے Kianazoic دور کہتے ہیں اس میں

Eocene Miocene Pliocene

ادوار شامل ہیں۔

چوتھا باب بالکل حالیہ زندگی سے متعلق ہے

پہلے باب میں ابتدائی سادہ زندگی کے آثار نمایا ہیں۔ اس دور کے شروع میں چھوٹے چھوٹے جانور، کیڑے، مکوڑے، جل بچھو اور پھر مچھلیاں پیدا ہوئیں۔ اس کے بعد کچھ نباتات کا آغاز ہوا اور اس دور کے آخر میں بڑے بڑے درخت پیدا ہوئے۔ درحقیقت جو کوئلہ ہم استعمال کر رہے ہیں وہ انہیں درختوں کی باقیات ہے۔ اس دور کے ختم پر آبی جانور بھی عالم وجود میں آئے۔

دوسرے باب میں رینگنے والے جانور بہت تھے۔ ان کی باقیات چٹانوں میں ملتی ہیں، لیکن اس نوع کے جانور اب مفقود ہیں۔ چنانچہ اس زمانہ میں خشکی اور تری کے ۸۰ فٹ لمبے جانوروں کا پتہ چلتا ہے لیکن ان میں ایک جانور بڑا عجیب تھا یعنی یہ آدھا رینگنے والا اور آدھا پرندہ تھا۔ اس کے پر ۲۰ فٹ لمبے چمڑے کے تھے اور اس کے جبڑوں میں دانت بھی تھے۔ اس کے بعد پستانی جانور پیدا ہوئے لیکن چوہوں کی قسم کے۔

تیسرے باب میں پستانی جانوروں میں ارتقا ہوا اس دور میں انسان بھی نمودار ہوا اور اشرف المخلوقات کہلایا۔

چوتھا باب ہماری موجودہ زندگی سے متعلق ہے۔ یہ کرۂ ارض اور اس کی کہانی تھی!!

سقراط فلاطون

عقلائے یونان

یونان کی سرزمین نے بعض ایسی بزرگ ہستیوں کو پیدا کیا جن کے کارنامے صدیاں گذرنے کے باوجود آج بھی زندہ جاوید ہیں اور جن کی تعلیمات کی روشنی علمی دنیا کو روشن اور منور بنا رہی ہے۔ ان یادگار ہستیوں میں سقراط، فلاطون اور ارسطو کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تینوں مفکرین کی قابلیت اور ذہانت کا لوہا سارا عالم مانتا ہے اور دنیا کی تمام جامعات میں ان کے خیالات اور کارناموں کا گہرا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

سقراط (۴۷۰ - ۳۹۹ ق-م) سقراط ایک معمولی گھرانے کا لڑکا تھا۔ اس کے قویٰ نہایت اچھے تھے لیکن صورت عجیب وغریب اور سر غیر معمولی طور پر بڑا تھا۔ دوست احباب اس کا خوب مضحکہ اڑاتے تھے اور وہ ان میں بہت ہر دلعزیز تھا۔

سقراط اپنے ساتھیوں کو سمجھاتا تھا کہ جن دیوتاؤں کی وہ پرستش کرتے ہیں، ان میں کوئی اصلیت نہیں ہے کائنات میں ایک عظیم الشان ہستی بھی ہے جو دنیوی قدر و منزلت سے بالا و برتر ہے۔ اس کا نام خدا ہے۔ یہ ہستی دیوتاؤں کی سی نہیں جو جذبات کے پتلے اور حیوانی طاقت کے مالک سمجھے جاتے ہیں بلکہ وہ حسن، صداقت اور نیکی کا ایک مکمل مجسمہ ہے۔ اس میں نام کو شر نہیں، وہ خیر ہی خیر ہے۔ پھر سقراط نے بتلایا کہ زندگی اسی وقت خوشگوار بن سکتی ہے جبکہ اس بزرگ ترین ہستی سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ روپیہ، پیسہ، قیمتی پوشاک اور دنیا کا سب جاہ وحشم اس کے آگے ہیچ ہے۔ اپنی روح اور نفس میں خدا کو بسا لینا، ابدی مسرت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

سقراط نے عوام کی تعلیم کے لئے کوئی خاص مدرسہ نہیں کھولا بلکہ ایتھنز کی گلیوں میں وہ برہنہ پیر پھرتا اور جو کوئی اس سے سوال کرتا، اس کا جواب دیتا اور بحث کرتا تھا۔ اس کی بحث کا طریقہ اس قدر دلچسپ اور اس کا

کردار اتنا نیک اور پسندیدہ تھا کہ ہر فرقہ کے لوگ جوق در جوق اس کے اطراف جمع ہوتے اور اس چشمۂ علم و فضل سے سیراب ہو کر جاتے تھے۔

تھوڑے ہی عرصہ میں سقراط کا مرتبہ عوام میں بلند ہو گیا۔ ایتھنز کے مذہبی پیشوا اور فلسفہ کے اساتذہ اس کی بڑھتی ہوئی شہرت کو دیکھ کر خار کھانے لگے، اس کا بری طرح سے پیچھا اٹھایا اور اعتراض کی بوچھار شروع کر دی۔

سقراط نے یہ حال دیکھ کر کہا کہ لڑنے جھگڑنے سے فائدہ نہیں، استدلال سے اس کا فیصلہ ہونا چاہیئے۔ استدلال پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ اسی سے خدا بھی مل سکتا ہے۔ اگر استدلال سے ثابت ہو جائے کہ دیوتاؤں کی کوئی اصلیت نہیں تو پھر ان کی پرستش سے کیا حاصل ہے؟ اس نے فلسفیوں پر وہ اعتراضات کئے کہ ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے سمجھایا کہ انسان کو چاہیئے کہ وہ ایماندار بنے۔ اپنے شعور کو ترقی دے اچھے اور برے میں تمیز کرے اور استدلال کے بعد نفس کی آزادی پر عمل کرے۔ لیکن مذہبی پیشوا کسی قیمت پر بھی اپنے اقتدار کو گھٹتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتے تھے، انہوں نے اس کے خلاف سازش کی، چاہتا تو وہ جان بچا کر بھاگ نکلتا لیکن نہیں وہ بہادر اور حق پرست تھا، اس نے جوانمردی اور خندہ پیشانی سے زہر کا جام پی کر صداقت کی قربان گاہ پر اپنی عزیز جان کی بھینٹ چڑھا دی۔

فلاطون (۴۲۷ - ۳۴۷ ق م) فلاطون سقراط کا شاگرد رشید تھا، یہ بہت خوبصورت اور امیرانہ طرز معاشرت کا انسان تھا۔ استاد کے انتقال کے بعد اس نے میگارا میں قیام کیا جہاں اس کی اقلیدس سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد وہ مصر گیا، وہاں علم ہندسہ کا مطالعہ کیا اور پھر جنوبی ایطالیہ جا کر اخلاقی فلسفہ کی تعلیم پائی۔ ۴۰ سال کی عمر میں ایتھنز آ کر اس نے ایک مدرسہ کی بنا ڈالی یہیں سے "اکاڈیمی" کی ابتدا ہوئی۔

فلاطون بلا کا ذہین اور فریس تھا۔ حیات انسانی پر اس کی تعلیمات کا گہرا اثر پڑا۔ اس کے خیال میں زندگی کا حسن "اظہار" میں پنہاں تھا اسلئے وہ اپنے خیالات کو بہت ہی سلجھے ہوئے انداز میں بیان کرتا تھا، سقراط کی تعلیمات کا احوال ہمیں فلاطون ہی کی تحریرات سے ملتا ہے۔ اس نے سقراط کے سادہ اور عام فہم خیالات کو فلسفہ کا رنگ دیا چنانچہ اس باعث اس کے خیالات عامیوں سے زیادہ فلسفیوں کے لئے ہیں۔

فلاطون مادیت کا قائل نہ تھا۔ وہ روحانیت پر زور دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مرئی اشیاء محض غیر مرئی شئے کے سایہ ہیں، اور خدا سے تعلق پیدا کرنا انسانی روح کی اعلیٰ ترین صفت ہے۔ تفکر اس کے فلسفہ اساس ہے۔

افلاطون کے زمانہ میں لوگ اس خیال کے حامی تھے کہ انسان ایک کل پرزے کے مانند ہے جو احساسات قبول کرتا ہے۔ گویا جانور میں اس میں فرق نہیں ہے فلاطون نے اس منطق کی تردید کی اور کہا کہ

ارسطو

بے شک انسان احساسات قبول کرتا ہے لیکن ان میں اچھے، برے، گورے، کالے، کمزور، طاقت ور وغیرہ کی تمیز پیدا کرتا ہے۔

فلاطون کی اہم تصانیف میں "جمہوریت" اور اس کے فلسفیانہ مقالات کا ترجمہ "سقراط کا مقدمہ اور اُس کی موت" ہیں۔

ارسطو (۳۸۴ - ۳۲۲ ق۔م) ارسطو مقدونیہ میں بمقام اسٹاگرا پیدا ہوا۔ یہ فلاطون کا شاگرد تھا۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد ایتھنز آکر اس نے کچھ دنوں رنگیلی زندگی بسر کی لیکن فلاطون کی تعلیمات کے زیر اثر وہ بہت جلد صداقت کا متلاشی بن گیا۔ اور اپنی ایک محبوبہ سے شادی کر کے بہترین متاہل زندگی گذاری۔

ارسطو بہت ہی نحیف الجثہ انسان تھا۔ اس کی آواز میں نسائیت تھی۔ وہ بہت ہی پر اخلاق، رحمدل اور شریف انسان واقع ہوا تھا۔ نہ سقراط کی طرح فقیرانہ زندگی بسر کرتا تھا اور نہ فلاطون کی طرح امیرانہ شان و شوکت کا خوگر تھا بلکہ اس کی زندگی ایک معیاری گھریلو زندگی تھی۔

ارسطو، فلاطون کی طرح روحانیت میں ڈوبا ہوا نہیں تھا بلکہ مادیت کی طرف مائل تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس پر فکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ زمین کیسے پیدا ہوئی یا علم کس طرح حاصل ہوا بلکہ اس پر غور کرنا چاہیئے کہ زمین کی ماہیت کیا ہے۔ اور علم سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس نے ایک مُردہ جانور کو لیکر اس کا معائنہ کیا، انڈوں پر مرغی بٹھلا کر دیکھا کہ بچہ پیدا ہونے کے کیا اسباب ہیں، مچھلیوں اور پرندوں کے جسم کی تشریح کی، پودوں کو جمع کر کے ان کا امتحان کیا شکاریوں سے ملکر جانوروں کے عادات اور رہنے سہنے کے متعلق معلومات حاصل کیا اور سیاحوں سے مختلف ممالک کے حالات اور واقعات دریافت کرتا رہا۔ قدیم کتابوں کو ممکنہ طور پر فراہم کرنے کی کوشش کی اور ان سے طبعی علوم کے حصول میں کوشاں رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ ارسطو پہلا سائنس داں تھا۔

ایتھنز والوں کے لئے یہ چیز بالکل نئی تھی، فلاطون بھی اسے پسند نہ کرتا تھا کیونکہ اس کے خیال میں دوسروں کی کتابوں کو پڑھکر علم حاصل پوچ بات تھی۔ خود کو نفسی کاوش کرنی چاہیئے وہ نہیں چاہتا تھا کہ ارسطو مادیت کے جنجال میں پڑے۔ لیکن ارسطو پر اس کا اثر نہ ہوا۔ گو فلاطون کی مخالفت اس پر شاق گذرتی تھی لیکن صداقت کے آگے مجبور تھا۔

فلاطون کہتا تھا "درخت اور مرغزار مجھ سے کچھ نہیں بولتے، انسان میرے دوست ہیں" ارسطو کہتا ہے کہ درختوں اور پودوں کا گہری نظر سے مطالعہ کرو، تمہیں ان میں حقائق کے دفتر ملینگے۔

برگِ درختان سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست، معرفتِ کردگار
(سعدیؒ)

ارسطو نے منطق، مابعد الطبیعات، طبیعات، اخلاقیات، معاشیات، سیاسیات، عروض اور شاعری پر بہت کچھ کام کیا ہے اور اس کی تصانیف آج بھی اپنا ایک خاص اثر رکھتی ہیں۔

موجدین و محققین

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ جیسے جیسے انسان کی ضروریات میں اضافہ ہوتا گیا ایجاد و اختراع کا میدان وسیع ہوتا گیا اور آج ہم تمدن کو جو اس رنگ اور معیار پر دیکھ رہے ہیں وہ پچھلی اور موجودہ نسلوں کی ذہنی کاوشوں اور ایجادات و اختراعات کا ایک مظہر ہے۔

ہر زمانہ میں چند ذکی الحس، سنجیدہ اور محنتی انسان پیدا ہوتے ہیں، اور ان کے کارنامے نہ صرف اپنے ملک و قوم کی بہبودی کے لئے مفید ثابت ہوئے بلکہ ان کا اثر ساری دنیا پر پڑا۔ ان کے نام تاریخ عالم میں زرین حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ یہاں ہم پچھلے زمانے کے چند موجدین و محققین کا تذکرہ کرینگے جن کی ایجادات و تحقیقات سے دنیا کے تمدن پر مختلف حیثیتوں سے گہرا اثر پڑا۔

جان گٹن برگ

جان گٹن برگ پندرھویں صدی کے اوائل میں جرمنی میں پیدا ہوا۔ یہ ایک جوہر تراش تھا اور قیمتی پتھروں مثلاً ہیرے اور نیلم کو تراشا کرتا تھا۔ اس میں اسے کمال حاصل تھا۔ چند دنوں میں اس فن میں اسے کافی شہرت حاصل ہوگئی۔ ایک دفعہ گنجفہ کے پتّے کو دیکھکر خود گنجفہ بنانے کا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اور لکڑی کا ایک ٹکڑا لیکر اس نے اس پر چند لکیریں کھینچیں اور لکڑی کو اس طرح تراشا کہ اس پر صرف لکیریں رہ گئیں۔ اب ان لکیروں پر سیاہی لگا کر اس نے کاغذ ان پر رکھکر دبایا۔ شروع شروع میں اس نے دیکھا کہ لکڑی بہت جلد خراب ہوجاتی ہے لیکن بعد میں اس نے مختلف قسم کی لکڑیاں استعمال کیں اور سیب کے درخت کی لکڑی اس کے مقصد کے لئے مفید پائی گئی۔ اس کے بعد اس نے ایک تصویر بنا کر اس کے نیچے کچھ عبارت لکھی اور پھر اسی طرح سے لکڑی چھیل کر تصویر اور الفاظ کو ابھارا اور سیاہی لگاکر کاغذ پر تصویر نکال لی۔ سیاہی میں چونکہ گاڑھاپن نہ تھا اس لئے کاجل اور تیل کا آمیزہ استعمال کیا جس سے اس کے منشاء کے مطابق نتائج برآمد ہوئے۔

ابتداء میں گٹن برگ نے اپنی تحقیق کا حال کسی سے نہ کہا لیکن بعد میں دو تین خاص دوستوں کو اس راز سے واقف کرایا۔ ان لوگوں نے دامے، درمے، سخنے اس کی مدد کی اور کئی مہینوں کی محنت و کاوش کے بعد یہ لوگ ۹۰ صفحات کی ایک کتاب چھاپنے میں کامیاب ہوئے۔

اس زمانہ تک کوئی کتاب اس طرح چھپی ہوئی نہ تھی۔ مصنفین بڑی محنت اور دقت سے جھلیوں پر لکھا کرتے تھے لیکن گٹن برگ نے انہیں جب یہہ کتاب بتلائی تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اتنے قلیل عرصہ میں اتنی بڑی کتاب کس طرح چھپ گئی۔

اس کے بعد گٹن برگ نے انجیل کی طباعت کا کام شروع کیا۔ اس کے لئے اس نے لکڑی کا تختہ تیار کیا۔ اتفاق سے اس پر چاقو گر گیا اور تختہ خراب ہوگیا ساری محنت ضائع ہوگئی۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لئے اس نے لکڑی کے کئی حروف بنائے، اس طرح

سے کہ انہیں ایک جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھا جا سکے نیز یہ حروف دوسری کتابوں کے لئے بھی استعمال کئے جا سکتے تھے۔ یہ بڑی مفید چیز ثابت ہوئی لیکن اب بھی اس میں خامی یہ تھی کہ سیاہی کے اثر سے چند دنوں میں لکڑی گل کر خراب ہو جاتی تھی۔ اس کے شرکا میں سے ایک نے دھات کا ایک ٹکڑا لیکر حرف بنایا اور پھر اس کا سانچہ بنا کر ایک ہی قسم کے کئی حروف ڈھال لئے۔ اس نئی تحقیق کی وجہ سے گٹن برگ نے پانچ سال کے عرصہ میں بائبل کی طباعت کا کام ختم کر دیا۔

انگلستان میں جیمس کاکسٹن نے طباعت کا کام شروع کیا اس طرح طباعت کے کام کا آغاز ہوا اور معلومات کے خزانوں سے غریب و امیر اور دور و نزدیک رہنے والے سبھی فائدہ اٹھانے لگے۔

گلی لیو گلی لیو فلارنس کے ایک امیر کا لڑکا تھا۔ ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوا۔ بچپن میں اسے شاعری اور موسیقی سے گہری دلچسپی تھی۔ اس کے والد نے علم طب کی تعلیم کے لئے جامعہ پائسا روانہ کیا۔ گلی لیو کو ریاضی سے خاص دلچسپی تھی لیکن اس زمانہ میں عام طور پر طالب علم یونان کے مفکر ارسطو کی تعلیمات

کاکسٹن کا مطبع

کا مطالعہ کرتے تھے اور اس کے ہم خیال تھے۔ گلی لیو بھی ایک مفکر تھا۔ مطالعہ کے بعد اس نے یونانی مفکرین سے اختلاف کیا۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ اگر ایک ہی مادہ کے دو مختلف وزن کے گولے مثلاً ایک دس پونڈ کا اور ایک ایک پونڈ کا ایک ہی وقت ایک ہی بلندی سے پھینکے جائیں تو وزنی گولہ جلد نیچے آ رہے گا۔ گلی لیو نے کہا یہ غلط ہے۔ ارسطو کی مخالفت کرتا ہوا دیکھکر لوگوں نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔ اپنے خیال کا ثبوت دینے کے لئے وہ چند پروفیسروں کے ہمراہ پائسا کے جھکے ہوئے مینار پر دس پونڈ اور ایک پونڈ کا وزن لیکر چڑھا۔ جب یہ گولے پھینکے گئے تو ایک ساتھ زمین پر گرے۔ اس طرح سے اس نے ارسطو کے خیال کو غلط ٹھہرا کر اپنی بات منوانے میں کامیابی حاصل کی۔ پروفیسر خجل ہو گئے اور انہوں نے اسے ایسی ایسی تکلیفیں پہنچائیں کہ گلی لیو کو آخرکار پائسا چھوڑنا پڑا۔

اس کے بعد گلی لیو نے سورج، چاند اور ستاروں کا مطالعہ شروع کیا۔ ان اجرام فلکی کو دیکھنے کے لئے اس نے ایک دوربین بنائی۔ سیسے کی ایک نلی لیکر

اس نے اس کے دونو طرف شیشہ کے ٹکڑے لگائے ایک طرف کے شیشہ کا ایک رخ چپٹا اور ایک گڑھے دار تھا۔ (مقعر عدسہ) اور دوسری طرف کے شیشہ کا ایک رخ چپٹا اور دوسرا ابھرا ہوا تھا (محدب عدسہ) اس آلے سے اشیا تین گنا بڑی نظر آتی تھیں۔ اس طرح گلی لیو نے بہت سے ایسے تارے دیکھے جو پہلے کبھی دکھائی نہیں دیے تھے۔ اس کے بعد اس نے

گلی لیو

ایک اور اچھی دوربین بنائی جس سے اشیا تیس گنا بڑی نظر آنے لگیں۔ اس دوربین سے اس نے دیکھا کہ چاند میں بھی پہاڑ ہیں۔

گلی لیو سے کئی سال پیشتر ایک عالم کوپرنکس نے یہ بتلایا تھا کہ سورج حرکت نہیں کرتا بلکہ زمین اور دوسرے سیارے سورج کے اطراف گردش لگاتے ہیں۔ گلی لیو نے اس کا پتہ اپنی دوربین سے لگایا۔ گو آج گلی لیو کے نام سے بچہ بچہ واقف ہے اور آج اس کی ایجاد چار دانگ عالم میں مشہور رہے تاہم اسے اپنے زمانہ میں کلیسا والوں کے ہاتھ سے بہت نقصان بھگتنا پڑا کیونکہ ان کے خیال میں یہ انجیل کو جھٹلا رہا تھا۔ روم میں پادریوں کے اجلاس پر اسے طلب کیا گیا اور ہدایت دی گئی کہ اگر آئندہ کبھی سورج کے سکون اور زمین کی حرکت کے متعلق ایک لفظ بھی زبان

نیوٹن

سے نکالے گا تو اسے سخت سزا دی جائے گی سزا کے خوف سے گلی لیو نے اپنی زبان تو بند کر دی لیکن تحقیق میں پہلے سے زیادہ انہماک کے ساتھ مصروف رہا۔

چند سال بعد گلی لیو کی بصارت جاتی رہی۔ یہ بڑا ہی حسرت ناک واقعہ تھا۔ آنکھیں اس کی تحقیق میں یار و مددگار تھیں وہی جب جا چکیں تو تحقیقات کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔ گلی لیو نے اٹھتر سال کی عمر میں انتقال کیا۔ انتقال کے

وقت وہ عوام کی نظروں میں مطعون تھا لیکن بعد میں لوگوں نے اس بڑے مفکر کے خیالات کو تسلیم کیا اور اس کی یاد میں اس کی قبر پر ایک عظیم الشان یادگار تعمیر کرائی۔

نیوٹن انگریز سائنس دان نیوٹن بمقام وولز تھارپ لنکن شائر میں ۱۶۴۲ء میں پیدا ہوا۔ جہاں اس کا خاندان ایک مزرعہ میں زندگی بسر کرتا تھا۔ بچپن میں اسے ایک مدرسہ میں شریک کیا گیا لیکن کتابوں سے اسے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ اس کے گھر سے قریب ایک ہوا چکی تھی۔ اسے دیکھ کر ایک دن اس نے اس کا ماڈل تیار کیا لیکن اگر ہوا نہ چلے تو یہ چکی بھی نہیں چلتی تھی۔ اس سقم کو دور کرنے کے لئے اس نے ایک آلہ استعمال کیا۔

نیوٹن کو پتنگ کا بہت شوق تھا اور وہ اپنے دوستوں کو پتنگ بنا کر دیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے ایک کاغذی قندیل بنا کر اس میں موم بتی رکھی اور اسے پتنگ سے باندھ کر ہوا میں اڑایا۔ اہل شہر نے سمجھا کہ کوئی ستارہ حرکت کر رہا ہے۔

چند سال بعد اس کی ماں نے اسے کسان بنانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے گلے کی نگہداشت کرنے کے بجائے ریاضی کی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ ایک روز وہ اپنے باغ میں مشغول مطالعہ تھا کہ درخت سے سیب ٹوٹ کر نیچے گرا۔ نیوٹن کے دل میں فوراً یہ خیال آیا کہ سیب نیچے کیوں گرا؟ یہ تو سب جانتے تھے کہ بے سہارا چیزیں نیچے گر پڑتی ہیں لیکن "کیوں گرتی ہیں؟" اس سے سب ناواقف تھے۔ بہت ہی غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ تمام اشیاء کو زمین اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس کا نام اس نے جاذبہ زمین رکھا اس کے علاوہ نیوٹن نے یہ بھی بتلایا کہ سورج، سیاروں، ستاروں اور چاند میں بھی اسی قسم کی کشش پائی جاتی ہے جس کے باعث یہ سب اپنے اپنے مقاموں پر ہیں۔ نیز نیوٹن نے یہ بھی واضح کیا کہ کائنات کی ہر شئے میں اس قسم کی کشش کی قوت ہوتی ہے جسے تجاذب کہتے ہیں۔

نیوٹن نے ریاضی پر بہت کچھ کام کیا ہے۔ مسئلہ ثنائی، مماسوں کے طریقوں اور علم احصاء کی مبادیات اسی کی ایجاد ہیں۔ اس کی سب سے مشہور کتاب پرنسپیا Principia ہے۔ اس کی پہلی جلد معکوس مربعوں کے کلیہ کے نتائج پر مبنی ہے، دوسری جلد مزاحم واسطوں میں حرکت، ماسکونیات، حرکیات اور امواج پر مشتمل ہے، تیسری جلد میں حرکت سیارگاں اور دُمدار ستاروں سے بحث کی گئی ہے۔ ۱۶۶۶ء میں وہ مناظری تحقیقات کی طرف رجوع ہوا اور انتشار نور کے مسئلہ کو واضح کر کے بتلایا کہ سورج کی روشنی سات رنگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو ایک مثلثی منشور میں سے گذرنے کے بعد اپنے اجزاء میں بٹ جاتی ہے۔ ۱۶۶۸ء میں اس نے انعکاسی دوربین ایجاد کی اور ۱۶۷۲ء میں رائل سوسائٹی میں منشوری تجربات اور تداخل نور پر مقالے پڑھے اور "نور" پر ایک کتاب شائع کی۔

۱۶۶۹ء میں نیوٹن جامعہ کیمبرج میں شعبۂ ریاضیات کا صدر مقرر ہوا۔ ۱۶۸۹ء اور ۱۷۰۱ء میں پارلیمنٹ میں جامعہ کی نمائندگی کی۔ ۱۷۰۵ء میں اسے "سر" کا خطاب ملا اور ۱۷۰۳ء سے لیکر مرتے دم تک رائل سوسائٹی کی صدارت کی۔ نیوٹن نے ایک کامیاب سائنس داں کی زندگی گذار کر ۱۷۲۷ء میں اس جہاں کو خیرباد کہا۔ اور اس کی

نعش ویسٹ منسٹر ابے میں دفنائی گئی۔

جیمس واٹ

جیمس واٹ ۱۷۳۶ء میں بمقام گرینایک پیدا ہوا۔ بھاپ انجن اس کی زبردست ایجاد ہے لیکن اس انجن کی کامیابی کا سہرا کچھ اس کے پیش روؤں کے بھی سر ہے۔ پاپن اور نیوکومن نے نامکمل بھاپ انجن بنائے تھے لیکن واٹ نے اس میں نہایت ہی سودمند ترمیم کر کے ایک اعلیٰ انجن بنایا۔

انجن چلانے کے لئے بھاپ بہت زمانہ پہلے ہی سے استعمال کی جاتی تھی۔ دو ہزار سال قبل اسکندریہ کے ہیرن نے ایک قسم کا بھاپ انجن ایجاد کیا تھا جس میں چھوٹی نلیوں سے نکلنے والی بھاپ کی قوت سے ایک کھوکھلے دھاتی گولے کو گھمانے کا کام لیا جاتا تھا۔ سترہویں صدی عیسوی میں پاپن نے ایک چھوٹا سا بھاپ انجن تیار کیا جو ایک لمبی نلی یا اسطوانہ اور فشارہ پر مشتمل تھا۔ اسطوانے میں پانی ڈالکر جب اسے گرم کیا جاتا تو پانی بھاپ بن کر فشارہ کو اوپر اٹھاتا تھا۔ آگ ہٹا لینے سے پانی ٹھنڈا ہوتا اور فشارہ نیچے آتا تھا۔ طرح ایک ضرب کے لئے چند منٹ درکار تھے بہرحال بھاپ سے کام لینے کی یہ ایک ابتدائی کوشش تھی۔

بھاپ انجن تھامس نیوکومن کی ایجاد ہے۔ یہ ایک وہار تھا۔ پاپن نے خیال کو کام میں لاکر اس نے ایک انجن بنایا جس کے ذریعہ کوئلہ کی کانوں سے پانی نکالنے کا کام لیا جاتا تھا اس نے اسطوانے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے، آگ ہٹا لینے کی بجائے اس پر ٹھنڈا پانی ڈالنے کا انتظام کیا۔ نیوکومن کے انجن لندن کے کوئلہ کی کانوں میں استعمال کئے جاتے تھے جب یہ انجن خراب ہوئے تو درستی کے لئے انہیں واٹ کے پاس روانہ کیا گیا اور یہیں سے اس کی ایجاد کی ابتدا ہوئی۔

جیمس واٹ بچپن ہی سے بلا کا ذہین لڑکا تھا اپنا تمام وقت مختلف مسائل پر غور و فکر کرنے میں صرف کرتا تھا۔ ایک دن اس کی چچی نے غصہ میں آکر کہا ”جیمس واٹ، میں نے تجھ جیسا کاہل لڑکا نہیں دیکھا کتاب لیکر پڑھو یا کہیں کام پر لگ جاؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم تمام دن کیتلی پر سے ڈھکن نکالنے اور پھر اس پر رکھنے میں مشغول رہتے ہو۔ پہلے ایک پیالی کو اور پھر چاندی کے چمچے کو بھاپ پر پکڑتے ہو یہ دیکھنے کے لئے وہ ٹونٹی سے کس طرح نکلتی ہے اور پھر گرم پانی کے قطرے جمع کرتے ہو کیا اس طرح اپنا وقت گنواتے تمہیں شرم نہیں آتی؟“

لیکن جیمس اپنا وقت نہیں کھو رہا تھا۔ وہ بھاپ کے متعلق معلومات حاصل کر رہا تھا اور یہ دیکھ رہا تھا کہ پانی کے قطرے چمچے سے کس رفتار سے گرتے ہیں۔ اکیس سال کی عمر میں جامعہ گلاسگو میں آلات سازی کی خدمت پر اس کا تقرر ہوا جب نیوکومن کا انجن اس کے پاس درستی کے لئے آیا تو اس نے دیکھا کہ اسطوانے کو گرم کرنے اور اسے پانی

سے ٹھنڈا کرنے سے حرارت کا نقصان ہوتا ہے اور انجن کی طاقت گھٹ جاتی ہے، تھوڑی سی فکر کے بعد اسے ایک خیال آیا کہ اسطوانے کو اتنا ہی گرم رکھنا چاہیئے جتنی کہ بھاپ گرم ہے۔ اس کے لئے اس نے ایک علیحدہ برتن استعمال کیا اور ایسا انتظام کیا کہ اس میں داخل ہو کر اسطوانہ کو ٹھنڈا کئے بغیر بھاپ کی تکثیف ہو جائے۔ اس طرح سے فشارہ اسطوانہ میں اوپر کی بھاپ کے اثر سے نیچے آنے لگا۔

اس طرح کا ایک انجن بنا کر واٹ نے آزمائش کیلئے برمنگھام روانہ کیا۔ یہ انجن بہت کامیاب ثابت ہوا جس انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کی اکثر کانوں سے انجنوں کی فرمائش کی گئی ۱۷۷۴ء میں اس نے ماتھیو بولٹن کی شرکت میں کاروبار شروع کیا اور خوب فائدہ کمایا۔ مزید کاوش کے بعد اس نے ایک مرکب انجن بنایا یعنی دو انجن ایک ہی بھاپ سے کام کرتے تھے۔

اس کے علاوہ جیمس واٹ Air - pump ہوا پمپ، بے دخان بھٹی وغیرہ کا بھی موجد تھا۔

۱۸۱۹ء میں اس کا انتقال ہوا۔

چند ادیب

ادب تہذیب و تمدن کا آئینہ ہے اور ادیب اس کے علمبردار، قوموں کی ترقی و زوال کی پارینہ داستانیں اسلاف کے کارنامے، تمدن کا ارتقاء تہذیب کی رنگا رنگی غرض کہ انسان اور اس کی زندگی کے سارے واقعات ادب کے گنجینہ میں محفوظ ہیں۔ اسلئے کسی ادیب کے کارناموں کا مطالعہ اس زمانہ کی تاریخ و تمدن کا مطالعہ ہے

جس طرح انسانی زندگی کے کئی شعبے ہیں اسیطرح ادب کی کئی اصناف، کالیداس نے ہندوستان میں ڈراما کی صنف کو اس وقت بام عروج پر پہنچایا جبکہ یونانی ڈراما کے بانی اس زلف گرہ گیر کی مشاطگی کر رہے تھے اطالیہ کا بزرگ ترین شاعر ڈینٹے اپنی بے مثال تصنیف ڈوائن کامیڈی کی بدولت رہتی دنیا تک باقی رہیگا اور علم تاریخ کا وہ زبردست ماہر جسے دنیا ابن خلدون کے نام سے یاد کرتی ہے نہ صرف مسلمانوں کا سب سے بڑا مورخ ہے بلکہ اس کا شمار دنیا کے مشہور ترین مورخوں میں ہوتا ہے۔

کالیداس کالیداس اس زمانہ میں پیدا ہوا جبکہ لوگ مصنف کی زندگی کے حالات میں قطعی دلچسپی نہ لیتے تھے۔ ان کے پیش نظر تصنیف ہی کا حسن و قبح ہوتا تھا اور وہ اسی کے تحفظ کی فکر کرتے تھے اسی لئے آج جبکہ زمانہ کا مذاق بدل گیا اور محققین اس کی زندگی کے حالات کا پتہ چلانے کی فکر میں ہیں کسی قسم کا نشان نہیں ملتا۔ مشرقی اور مغربی دونوں طرز کے محققین تلاش و جستجو سے تھک کر چور ہو گئے لیکن زندگی کے حالات تو بڑی چیز تاریخ پیدائش بلکہ زمانہ پیدائش بھی بھی قطعی طور پر صحیح معلوم نہ ہو سکا۔ چھٹی صدی قبل مسیح سے لیکر گیارہویں صدی بعد مسیح تک کی روایتیں ملتی ہیں۔ ہم نے اکثریت پر غور کیا تو پہلی صدی قبل مسیح

کے لگ بھگ کا زمانہ قابل قبول نظر آتا ہے۔

اس کی تصانیف کے سوا اس کے سوانح حیات کا کوئی اور ذریعہ نظر نہیں آتا۔ اس لحاظ سے اجین اس کا مقام پیدائش ہے جس کی تعریف میں وہ متعدد مقامات پر رطب اللسان نظر آتا ہے۔ وہ "شیوا" کی پوجا کرتا ہے جو شکنتلا کے آخری حصہ سے صاف ظاہر ہے۔ وہ بڑا سیاح تھا کیونکہ "رگھو ونشا" میں اس نے بنگال، بہار، اوڑیسہ کا ذکر تاریخی اور جغرافیائی نقطہ نظر سے کیا ہے۔ وہ ایک جید عالم نظر آتا ہے۔ زبان پر اتنی قدرت تھی کہ مطالب کے اظہار میں عجز نمایاں نہیں ہوا۔ بیان پر اتنا عبور تھا کہ ادق سے ادق مسئلہ کو سلیس سے سلیس انداز میں واضح کر دیا ایسا کہ پڑھنے والے کو بار بھی محسوس نہوا۔ صرف و نحو کا اتنا خیال رکھا کہ اس کا کلام سند ہوگیا۔ ادبی خوبیوں کے علاوہ جابجا علم طب۔ نجوم اور مابعد الطبیعات کے حوالے بھی اس کی تصانیف میں ملتے ہیں غالباً یہ سب "ویدوں" کے اثرات تھے جن کا اس نے خاص طور پر مطالعہ کیا تھا۔

کالیداس کا مشہور ترین ڈراما "شکنتلا" ہے۔ اس کا پہلا ترجمہ انگریزی میں ۱۷۸۹ء میں ہوا۔ پھر ۱۷۹۱ء میں جرمن اور ۱۸۳۰ء میں فرانسیسی تراجم شائع ہوئے۔ اس کا شمار دنیا کے مشہور ترین ڈراموں میں ہوتا ہے "وکرم اروسی" بھی اس کا ایک دلچسپ ڈراما ہے جس کے ترجمے جرمن اور انگریزی میں بھی ہوئے۔

یہ صحیح ہے کہ کالیداس کی عالمگیر شہرت کا باعث اسکے ڈرامے ہیں لیکن اس کی رزمیہ اور بزمیہ نظمیں بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتیں "راگھو ونشا" اور "کمار اسمبھاوا" اسکی مشہور رزمیہ نظمیں ہیں۔ اول الذکر کا موضوع وہی ہے جو راماین کا ہے اور اس کا ہیرو بھی رام ہی ہے۔ آخر الذکر میں جنگ کے دیوتا کے متعلق تفصیلات بیان کی ہیں اور اسی کو ہیرو بنایا ہے۔ بزمیہ نظموں میں "مگھا دوتا" اور "رتو سمھرا" زیادہ مشہور رہیں۔ ان کے علاوہ ایک نظم "نلو دیا" ہے جس میں نل دمینتی کے عشق کا مشہور قصہ درج ہے۔

ڈینٹے اطالیہ کا سب سے بڑا شاعر ڈینٹے ازمنہ وسطہ کی یادگار ہے۔ اس کی شاعری ازمنہ وسطہ اور نشاۃ ثانیہ کی درمیانی کڑی ہے۔ وہ روجر بیکن، سینٹ تھامس اکوئنس، سینٹ لوئی وغیرہ کا ہمعصر تھا۔ مشہور مصور گوئیٹو اس کا ساتھی اور دوست تھا۔

ڈینٹے ۱۲۶۵ء میں بمقام فلارنس پیدا ہوا۔ ابھی نو برس ہی کا تھا کہ اس زمانہ کی مشہور حسینہ "بیٹرس" کے تیر نظر کا گھائل ہوگیا۔ اس نے کبھی اس پیکر حسن سے دوستی بڑھانے کوشش نہیں کی اور شاید اسی وجہ سے اس کے جگر سے تیر نیم کش نہ نکلنا تھا نہ نکلا اور آخر عمر تک اس کی خلش سے تڑپتا رہا۔

بیٹرس کے انتقال تک ڈینٹے نے کوئی طویل نظم نہیں لکھی مگر اس کی جوان مرگی کا اس کے دل پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ اس نے شہرۂ آفاق نظم "ڈوائن کامیڈی" اپنی محبت کی یادگار میں لکھنے کی ٹھان لی۔

ڈینٹے کی جوانی کا زمانہ تھا اور فلارنس میں Guelphs اور Ghibellines کی فرقہ وارانہ خانہ جنگیوں کا بازار گرم تھا اول الذکر جماعت پوپ کی طرفدار تھی اور آخر الذکر شہنشاہ کی ہوا خواہ۔ عمر کا تقاضا تھا کہ ڈینٹے بھی ان معرکہ آرائیوں میں حصہ لیتا چنانچہ اس نے بھی شہنشاہ کے

ڈینٹے جہنم میں

پرستاروں کے زمرے میں اپنے آپ کو شامل کرلیا۔ اس کا جوش و خروش اتنا بڑھا کہ وہ بہت جلد سرغنہ ہوگیا مگر یہ اُسکی بدقسمتی تھی کہ اس کی جماعت کو شکست پر شکست اور ناکامی پر ناکامی نصیب ہوئی۔ یہاں تک کہ اس کی گرفتاری اور زندہ جلادینے کی تجویز ہوئی۔ ان سے بچنے کے لئے اسنے اپنے آپ کو جلاوطن کرلیا۔ مگر اس صحرانوردی میں بھی اسکو یہی فکر رہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اپنے مخالفین سے

وہ غربت ہی میں کیوں نہ ہو پسند کی۔ ۱۳۰۲ء سے ۱۳۲۱ء تک شہر بدر رہ کر ۱۴ستمبر ۱۳۲۱ء کو اس نے بمقام "ریونیا" انتقال کیا۔

اس کی تصانیف میں جو شہرت "ڈوائن کامیڈی" کو حاصل ہوئی وہ قابل رشک ہے۔ یہ طویل نظم اس نے "ورونا" اور "ریونیا" میں لکھی۔ یہ ایک خواب کی تفصیل ہے جو مرنے کے بعد روح پر طاری ہوتا ہے۔

ڈینٹے جلاوطنی کی حالت میں

انتقام لیا جائے۔

آخر وقت میں اسے فلارنس آنے کی اجازت تو دی گئی مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ جرمانہ ادا کرے اور "بےچارگی" کا لباس پہنکر سینٹ جان کی گرجا میں داخل ہو اور اپنے کرتوت کی معافی چاہے ڈینٹے نے اس بےعزتی سے وطن واپس ہونے کو عزت کی موت چاہے

اس کی دو خصوصیتیں قابل ذکر ہیں ایک یہ کہ وہ دنیا کی سب سے اچھی "سیاحتی داستان" ہے اور دوسرے یہ کہ مناظر کی جو تفصیلات شاعر نے بیان کی ہیں وہ مشاہدہ کا کمال ہے۔

شاعر تخیل کے پروں سے جنت اور دوزخ کی سیر کرتا ہے اور وہاں پہنچتا ہے جہاں فرشتوں کے بھی

پیدا جلتے ہیں۔ ان ہستیوں سے ملتا ہے جن کے نام دنیا والوں نے ابھی فراموش نہیں کئے اور ان حالات کو قلمبند کرتا ہے جن کے دیکھنے کے لئے ہر انسان کی آنکھیں ترستی ہیں۔

ابن خلدون

ابوزید ابن محمد ابن خلدون ۱۳۳۲ء میں طیونس نامی مقام پر پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم سخت نگرانی میں ہوئی اور اس سبب سے شاید اس نے بہت جلد زبان پر قابو حاصل کر لیا۔ پھر مختلف علوم و فنون کا مطالعہ کیا۔ ۱۳۵۲ء میں سلطان ابوعنان کے دربار میں نوکر ہو گیا۔ ۱۳۵۶ء میں محض بعض شکوک کی بنا پر اسے قید کر دیا گیا۔ یہاں اس نے دو سال پورے گذارے آخر بادشاہ کے انتقال پر اس کے وزیر الحسن ابن عمر نے اپنے اعتماد پر اس کو رہا کیا اور دوبارہ خدمت سے سرفراز کیا۔ ایک عرصہ تک وہ برابر اپنے مفوضہ خدمات بلاشکایت انجام دیتا رہا لیکن بڑھتے ہوئے اثر نے چند درباریوں کو اس کی مخالفت پر آمادہ کیا اور وہ سلطان کو اس کی طرف سے بدظن کرنے لگے۔ یہ حال دیکھکر ابن خلدون نے ہسپانیہ کا رخ کیا۔ اس کے علم و فن کا شہرہ یہاں پہنچ چکا تھا اس لئے دربار میں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی مگر تھوڑے ہی دن بعد وہ مصاحبین کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔ اس ڈر سے کہ کہیں بادشاہ کا عتاب نہ ہو جائے وہ چپکے سے ۱۳۶۲ء میں افریقہ چلا گیا۔ یہاں کا سلطان ابوعبداللہ کسی زمانہ میں اس کے ساتھ قید میں رہ چکا تھا۔ پرانے تعلقات کا خیال کر کے سلطان نے غیر معمولی طور پر اچھا برتاؤ کیا لیکن سلطان کے انتقال کے بعد ہی وہ پھر پریشان ہو گیا۔ آخر تنگ آ کر اس نے ایک خانخاہ میں باقی زندگی علم و ادب کی خدمت میں گذارتے کی ٹھان لی۔ ۱۳۷۰ء تک یہاں تصانیف و تالیف میں مشغول رہکر وہ پھر وطن لوٹا اور اپنی مشہور کتاب "تاریخ بربری" لکھی۔ کچھ دنوں بعد حج کے ارادے سے مکہ گیا۔ وہاں سے قاہرہ پہنچا۔ یہاں کا سلطان اس کے تاریخی کارناموں سے واقف تھا اور اس نے اس کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ قاضی کی عظیم الشان خدمت اس کے تفویض کی گئی۔ "ہسپانیہ میں عربوں کی حکومت" کے نام سے اس نے ایک دلچسپ تاریخ لکھنی شروع کی اور اس خیال سے کہ پورا وقت اسی کی نذر کرے اس نے پانچ مرتبہ نوکری سے استعفیٰ دیا لیکن ہر دفعہ اسے خدمت کے لئے مجبور کیا گیا۔ ۱۴۰۰ء میں وہ دمشق بھیجا گیا تاکہ تیمور کا راستہ روکے اور اس کی بڑھتی ہوئی فتوحات میں حائل ہو لیکن ابن خلدون ایک زبردست مورخ اور ایک جید عالم ہونے کے باوجود بھی سپہ سالار نہ تھا نتیجہ کے طور پر وہ تیمور کے بڑھتے ہوئے سمندر کے آگے ایک تنکا ہو کر رہ گیا۔ تیمور جانتا تھا کہ ابن خلدون کس حیثیت کا انسان ہے اس لئے اسنے اس کی جان بخشی کی۔ وہ مصر واپس ہوا۔ اور یہیں اس نے ۱۶ مارچ ۱۴۰۶ء کو انتقال کیا۔

ابن خلدون علم تاریخ کا بہت بڑا ماہر خیال کیا جاتا ہے۔ عربوں کی تاریخ نویسی کی جو شہرت دنیائے علم میں ہوئی اس میں اس نامور مورخ کے کمال کو بھی دخل ہے۔ تاریخی واقعات کی چھان بین وہ خاص احتیاط سے کیا کرتا تھا۔ اس کا طرز اس قدر سنجیدہ اور عالمانہ تھا کہ بہت کم مصنفین اس پایہ کے ملتے ہیں۔

۲۸

مشہور عورتیں

ابتدائے آفرنیش سے عورت اور مرد کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ نظریۂ ارتقاء کی رو سے یہ بتانا مشکل ہے کہ سب سے پہلے جو صورتِ انسانی مکمل ہوئی وہ عورت کی تھی یا مرد کی مگر یہ سب جانتے ہیں کہ جہاں سے انسانیت کا سلسلہ شروع ہوا وہاں عورت اور مرد دونوں کا وجود تھا اور اگر روحانی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ آدم کا دل حوا کے بغیر جنت میں بھی نہ لگا اور جب قدرت کو اس کا احساس ہوا تو اس نے عورت کو مرد کے پہلو سے پیدا کیا تاکہ اس تعلق کی وجہ سے دونوں میں ربط قایم رہے اور وہ جب دنیا میں بھیجے جائیں تو ایک دوسرے کے رفیق حیات کہلائیں۔

انسانی جد وجہد کے کارنامے عورت کے ذکر کے بغیر اس لئے مکمل نہیں ہو سکتے کہ یہ منشائے قدرت کے خلاف ہے۔ علاوہ اس کے کسی نہ کسی حیثیت سے وہ ایک دوسرے کے زیر اثر رہے ہیں اس طرح کہ انکا علیحدہ کرنا گویا ناخن کا گوشت سے جدا کرنا ہے۔

ہم یہاں چار ایسی عورتوں کا ذکر کریں گے جنھیں کسی نہ کسی خصوصیت کی وجہ سے شہرت عام کے دربار میں بقاء دوام کا تاج مل چکا ہے۔ بلقیس ملکہ سبا اپنے تخت اور اپنی امارت کی وجہ سے زبان زد خاص وعام ہے۔ زلیخا کے عشق کی داستان ہماری شاعری کا جزو لاینفک ہے۔ کلیوپیٹرا کے حسن وجمال کی تفصیل ہم تک پہنچ چکی ہے اور سیتا! ——— اس پاکدامن پیکر نسائیت کو کون نہیں جانتا؟

بلقیس ملکہ سبا

بلقیس شراحیل بن مالک بن ریان کی بیٹی اور تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح جنوب مغربی عرب کے صوبہ یمن جو سبا اور حمیر کا ملک کہلاتا تھا کی شہزادی تھی۔ دنیا میں آکر آنکھیں کھولی تو دولت وثروت کی فراوانی دیکھی اور پروان چڑھی تو شان وشوکت کو اپنے جلو میں دیکھا۔ جوانی کے ساتھ ساتھ حسن کے چرچے بھی دور دور تک پھیلنے لگے حضرت سلیمان کے کانوں تک اس کا حال ہُدہُد کی زبانی پہنچا۔ لیکن لگے ہاتھوں یہ خبر بھی اڑی کہ اس کے پاؤں گدھے کے سے ہیں اور انگلیاں بھی ندارد ہیں۔ سلیمان کو ان کے دیکھنے کا بیحد اشتیاق ہوا اور انہوں نے ہُدہُد کے ذریعہ اپنا نامہ روانہ کیا۔ علاوہ اس کے اپنے درباریوں سے دریافت کیا کہ بلقیس کے عجائب روزگار تخت کو ان کے دربار میں جلد سے جلد کون لاسکیگا۔ کسی نے کہا کہ دربار برخاست کرنے تک وہ حاضر کر دیگا لیکن ان کے وزیر آصف بن برخیا نے چشم زدن میں تخت لانیکا وعدہ کیا اور چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

حضرت سلیمان کا خط ہُدہُد نے بلقیس کو اس کے دار الخلافہ قیطور میں پہنچایا جس کے جواب میں اس نے اپنے وزیروں سے مشورہ کرکے لکھا کہ اگرچہ قیطور اور بیت المقدس کے درمیان عموماً سات برس کا راستہ ہے تاہم وہ تین برس کے اندر ہی اندر اپنے آپ کو حسب الحکم پہنچائیگی۔

چونکہ حضرت سلیمان چاہتے تھے کہ بلقیس کے پاؤں کے متعلق غلط فہمی دور کریں اسلئے جب وہ ان کے ہاں آئی تو انھوں نے شیش محل میں ملاقات کی۔ بلقیس کو شیشہ پر پانی کا گمان ہوا اور اسی خیال سے اس نے پنڈلیوں سے کپڑا ہٹایا اور اس کے ساتھ ہی حضرت سلیمان کی متلاشی آنکھوں نے دیکھ لیا کہ افواہ غلط تھی۔

بلقیس کو اپنا تخت حضرت سلیمان کے پہلو میں دیکھکر حد درجہ تعجب ہوا۔ یہ شہرہ آفاق تخت طول عرض اور اونچائی میں تیس تیس گز تھا اور چاندی اور سونے سے بنایا گیا تھا۔ جابجا اس پر قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے اس کے اوپر کے حصہ میں سات خانے تھے جن میں بڑے بڑے موتی لٹکتے تھے اور اس کے چاروں پائے یاقوت۔ زمرد، پکھراج اور موتی کے تھے۔

بلقیس نے حضرت سلیمان سے متعدد پہیلیوں کا حل دریافت کیا اور جب سارے جوابوں سے تشفی ہوئی تو اس نے اپنا سر تسلیم خم کر دیا اس کے بعد ہی حضرت سلیمان نے اس سے عقد کر لیا۔

زلیخا

ایکدفعہ زلیخا نے خواب میں ایک حسین پیکر انسانی کو دیکھا دل کی گہرائیوں میں اس خواب کی تعبیر کی خواہش پیدا ہوئی اور عرصہ تک اسی فکر میں مبہوت رہی۔ دوبارہ پھر وہی شکل خواب میں نظر آئی۔ چاہتی تھی کہ اتا پتا پوچھے لیکن رعب حسن نے گویائی سلب کر دی۔ بے بس ہوکر خیالی تصویر ہی کی پرستش پر اکتفا کرنے کی ٹھان لی مگر حسن اتفاق سے تیسری مرتبہ وہی ماہ پیکر پھر خواب میں نظر آیا۔ اب تو اس نے بے باکی سے لڑکھڑاتی زبان میں پوچھ ہی لیا۔

"اے ماہ رو میں تجھے کس پتہ سے ڈھونڈوں؟"

"وزیر مصر کے پتہ سے" جواب ملا۔

بڑے بڑے شہزادوں کے پیام آتے لیکن زلیخا سب کو ٹھکرا دیتی۔ لوگوں کو تعجب ہوتا مگر اس کے دل کا راز کسی پر آشکارا نہ ہوتا۔ کوئی کہتا کچھ کوئی کہتا کچھ۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ بالآخر زلیخا میں جب تاب ضبط باقی نہ رہی تو اس نے اپنی بوڑھی کھلائی کو اپنا ہم راز بنایا اور اپنی دل کی لگی کا حال بتایا۔

بڑھیا نے موقع پاکر باپ سے ماجرا بیان کیا اور یہ طے پایا کہ ایک ہوشیار درباری کو مصر روانہ کیا جائے تاکہ وہ وزیر کو زلیخا سے شادی کرنے پر آمادہ کرے۔ بہت کچھ کہنے سننے پر وزیر مصر راضی تو ہوا لیکن بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ شادی کے قابل نہ تھا۔

زلیخا کی برات شہر مصر کے دروازہ پر پہنچی تو وزیر استقبال کے لئے گیا اور جب یہ خبر زلیخا تک پہنچی تو شوق دیدار میں وہ آپے سے باہر ہوگئی اور محل کا پردہ ہٹا کر اپنے نادیدہ محبوب کو جو دیکھتی ہے تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "یہ کیا؟ یہ تو بالکل ہی دوسرا شخص ہے!" اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

مگر اب کر ہی کیا سکتی تھی خود کردہ را علاج نیست۔ اسی کو غنیمت سمجھکر کہ اس کی عصمت و عفت محفوظ ہے زندگی کے دن گذارنے لگی لیکن رہ رہ کر خیال آتا تھا "دھوکا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ پھر اس طرح وزیر مصر کا پتہ دینے کا مطلب؟"

اسی اثناء میں شہر میں دھوم مچی کہ بازار میں ایک ایسا حسین غلام بکنے آیا ہے جس سے زیادہ خوبصورت انسان کسی نے اسوقت تک نہیں دیکھا۔ اس کے

خریدنے کے لئے سارا شہر ٹوٹ پڑا۔ بڑے بڑے دولت مند، تاجر، شہزادے اور امراء سبھی خریداروں میں تھے لیکن اُن کے دوش بدوش ایک بڑھیا بھی اپنی ساری پونجی جو کتے ہوئے سوت کی چند لٹوں پر مشتمل تھی بازار میں لے آئی۔ شاہ مصر کا نام خریداروں کی فہرست میں سب سے اول تھا مگر جوں ہی زلیخا نے اس غلام کا نظارہ کیا اس کے ہوش جاتے رہے "ہائیں یہ تو وہی میرا محبوب ہے" اس نے دلیں کہا۔

وزیر کے ذریعہ سے اس نے بادشاہ کے دربار میں معروضہ پیش کیا کہ چونکہ اس کے کوئی اولاد نہیں ہے اس لئے اس کی خدمات کے صلہ میں اس غلام کو اس کے حوالے کیا جائے۔ بادشاہ نے درخواست واجبی دیکھکر منظور کی۔ اور یہ خوبرو نوجوان (حضرت یوسفؑ) وزیر کے محل میں زلیخا کی نگرانی میں مثل اولاد کے پرورش پاتا رہا۔ زلیخا کی ساری مہربانی اور شفقت صرف اسی لئے تھی کہ کسی نہ کسی طرح مطلب براری ہو سکے مگر حضرت یوسف کو خواہشات نفس پر تعجب انگیز حد تک قابو تھا۔ ایکدن اُسی دھن میں زلیخا نے یوسف کو اپنے باغ میں تنہا پاکر ترغیب کے جال میں پھانسنا چاہا لیکن ساری تدبیریں اُلٹ گئیں اور جب یوسف محل سے نکل رہے تھے وزیر آگیا۔ وہ انہیں ساتھ لیکر اندر گیا۔ زلیخا کو گمان گذرا کہ یوسف نے کہیں واقعہ کہہ نہ دیا ہو اور اسی اندیشہ میں اس نے یوسف ہی کو الٹا ملزم قرار دیا۔ مگر دامن کے چاک نے یوسف کو بیگناہ قرار دیا۔

یہ واقعہ سارے شہر میں آگ کی طرح پھیل گیا اور ساری عورتیں اس کو طعنہ دینے لگیں۔ زلیخا نے تنگ آکر ایکدن ساری عورتوں کو دعوت دی اور جب وہ ترنج کاٹ رہی تھیں اس نے یوسف کو اندر بلایا سب عورتیں حیران بیٹھی تھیں یوسف کو دیکھکر آپے میں نہ رہیں اور انہوں نے اپنے ہاتھ ترنج کی بجائے کاٹ لئے۔ اس واقعہ کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ یوسف کو دیکھکر ہوش کھونا طعنہ زنی کے قابل فعل نہیں ہے۔

یوسف قید کر دیئے گئے اور ایک عرصہ بعد جبکہ وزیر مصر کا انتقال ہو چکا تھا وہ رہا ہوئے اور وزیر مقرر کئے گئے۔ زلیخا بوڑھی ہو گئی تھی لیکن اس کے دل سے یوسف کی محبت نکلی نہ تھی۔ یہ دیکھکر یوسف کا دل پسیجا اور انھوں نے اس سے شادی کرلی۔ ان ہی کی دعا سے زلیخا از سر نو جوان ہوئی۔

کلیوپیٹرا (۵۱ ق-م - ۳۰ ق-م) مصر کے بطلموسی بادشاہوں میں سب سے آخری ملکہ کلیوپیٹرا تھی۔ اس کا باپ بطلیموس اولیت جب مرا تو اس نے اپنی بڑی بیٹی کلیوپیٹرا اور اپنے بڑے بیٹے بطلیموس کو شریک ہوکر مصر پر حکومت کرنے کی وصیت کی۔ اس وصیت نامہ میں یہ ہدایت بھی تھی کہ یہ دونوں بھائی بہن ملک کے دستور کے مطابق شادی کریں۔

پوتی نیوس جو بطلیموس کا اتالیق ہوگیا تھا اس فکر میں تھا کہ کسی طرح کلیوپیٹرا کو تاج سے محروم کردے۔ یہ رنگ دیکھکر کلیوپیٹرا شام چلی آئی اور سیزر تک پہنچنے کی فکر میں مبتلا ہوئی۔ آخر موقع پاکر سیزر کے پاس اسکندریہ پہنچ ہی گئی اور اپنے حسن وجمال کی وجہ سے اس کی منظور نظر بھی ہوگئی اسی تعلق کی بنا پر اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سیزرون رکھا گیا۔ سیزر نے کلیوپیٹرا کو اجازت دیدی کہ

کلیوپیٹرا کی موت

وہ اس کے نام سے مصر پر حکومت کرے۔

سیزر جب روما واپس ہوا تو وہ قتل کر دیا گیا اور خانہ جنگی کا ایک ہنگامہ عظیم برپا ہوا۔ کلیوپیٹرا کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کس کا ساتھ دے۔ انٹونی کو حسن اتفاق سے فتح حاصل ہوئی اور اسی سلسلہ میں جب وہ سلیقیہ سے گذرنے لگا تو کلیوپیٹرا کے نام حکم بھیجا کہ وہ شہر طرسوس میں اس سے ملاقات کرے۔

جس شان سے کلیوپیٹرا ملاقات کے لئے گئی ہے وہ ایک تاریخی یادگار ہے اس کا سن اسوقت پچیس[۲۵] برس کا ہوگا اور اسی وجہ سے حسن کے ساتھ ساتھ تجربہ کار بھی ہو چکی تھی۔ ایک پر تکلف کشتی پر سوار ہوئی جس کے سامنے کا حصہ خالص سونے کا تھا۔ خود دیبی وینس کا لباس پہنے کچھ اس انداز سے چلی کہ کنارہ پر ایک ہجوم اس کے دیکھنے کے لئے بیتاب تھا۔ یہاں پہنچکر اس نے انٹونی اور اسکے مصاحبوں کو اتنی پر تکلف دعوتیں دیں کہ وہ سب اس کی دولت و ثروت دیکھکر دنگ رہ گئے۔ انٹونی ایک دل پھینک شخص تھا اسلئے کلیوپیٹرا کی زلف گرہ گیر کا کچھ اسطرح اسیر ہوا کہ اپنے آپ کو عیش و عشرت کی ہی نذر کر دیا۔

انٹونی کو کلیوپیٹرا سے بیحد محبت تھی لیکن آخر آخر میں جب اس کی قوت کو روما میں زوال ہو چکا تھا وہ ملکہ سے کیسقدر بدگمان بھی ہونے لگا تھا خصوصاً اس بات سے بہت ڈرتا تھا کہ کہیں اس کو زہر نہ دیدیا جائے۔

اوکتے دیانوس اور انٹونی میں جو لڑائیاں ہو رہی تھیں انھیں پر ان دونوں کی قسمتوں کا فیصلہ منحصر تھا کلیوپیٹرا کو توقع تھی کہ انٹونی کو فتح ہوگی اور وہ ملکہ روما کہلائیگی۔ مگر عیش و عشرت نے انٹونی کی فوجی طاقت کا قلع قمع کر دیا تھا۔ اسپر طرفہ یہ ہوا کہ انٹونی نے کلیوپیٹرا کو بھی میدان جنگ میں ساتھ رکھا۔ انٹونی کی قسمت میں ایک زبردست شکست لکھی تھی اور وہ ہو کر رہی۔ کلیوپیٹرا نے اپنے آپ کو ایک عمارت کے اندر بند کر لیا اور انٹونی کو خبر کرائی کہ وہ مر گئی۔ یہ سنکر انٹونی نے خودکشی کے ارادے سے سینہ میں تلوار بھونک لی مگر دم نکلنے سے پیشتر کلیوپیٹرا نے اسے اپنے ہاں اٹھوا کر منگوایا جہاں اس نے اپنی جان دی۔

اوکتے دیانوس چاہتا تھا کہ کلیوپیٹرا زندہ گرفتار کی جائے اور چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حالانکہ انتہائی حفاظت اس بات کی کیگئی کہ وہ خودکشی نہ کرنے پائے مگر پہرہ والوں کو دہوکا دیکر اس نے خودکشی کر لی بعض کہتے ہیں کہ اس نے زہر کھا لیا اور بعضوں کا خیال ہے کہ اس نے اپنے آپ کو سانپ سے ڈسوا لیا۔

سیتا

کہتے ہیں کہ آج سے تقریباً تیرہ لاکھ پانچ ہزار برس پہلے جنک پور میں بلا کا قحط ہوا۔ راجہ پرجا سبھی کو اس کا بچار رہا۔ پنڈتوں نے کہا کہ اگر راجہ اپنے ہاتھ سے خود ہل چلائیں تو غلہ افراط سے پیدا ہو۔ راجہ رضامند ہوا اور جب وہ ہل چلا رہا تھا اس کے ہل کی نوک زمین میں ایک مٹکے سے ٹکرائی۔ مٹکا نکالا گیا اور اسی سے سیتا پیدا ہوئی۔ راجہ جنک نے اس کو مثل اولاد کے پالا پوسا۔ ایک دن پرشورام رشی دربار میں حاضر ہوا۔ اس نے اپنی کمان جو بڑی بھاری وزنی تھی باہر چھوڑی۔ اتفاقاً سیتا جو پانچ برس کی تھی کھیلتے کھیلتے اس طرف کو آنکلی اور اس کمان کو کھلونا سمجھکر دور تک اٹھا لیگئی۔ جب اس طاقت کا جنک مہاراج کو علم ہوا تو اس نے یہ شرط لگا دی کہ جو اس کمان کو کھینچے گا اسی سے سیتا بیاہی جائے گی۔

سوئمبر میں دیوتا۔ رشی۔ راکشش۔ راجہ مہاراجہ سبھی
شریک تھے اور سبھوں نے زور آزمائی کی لیکن رام اور سیتا
کا جوڑا قسمت میں لکھا تھا چنانچہ وہی پورا ہو کر رہا۔ رام چندر
جی نے کمان اتنی کھینچی کہ وہ دو ٹکڑے ہوگئی۔ سیتا نے
یہ دیکھکر مالا ان کے گلے میں ڈالدی۔

رام چندر جی کے پتا دسرتھ جب بوڑھے ہوگئے
تو انھوں نے خیال کیا کہ رام کو اپنا ولیعہد اور شریک کار مقرر
کریں۔ رام کی سوتیلی ماں رانی کیکئی کو اپنے بیٹے بھرت کی
فکر تھی اس لئے یہ خیال اسے بڑی تکلیف دینے لگا اور
اس نے موقع پاکر رام کو جلاوطن کرنے کا فرمان دسرتھ سے
حاصل کر ہی لیا۔

رام جلاوطن ہوگئے اور ایک عرصہ کے بعد جب
دسرتھ کا انتقال ہوا تو بھرت نے اپنی ماں کی امید کے
خلاف تخت نشینی سے انکار کر دیا اور رام کی تلاش میں
بن باس ہوگئے۔ آخر ایک دفعہ جب رام سے ملاقات
ہوئی تو انھوں نے دسرتھ کے انتقال کی خبر سنائی اور
گدی نشینی کی التجا کی لیکن رام کے قبول نہ کرنے پر مجبوراً
خود بھی جلاوطن ہوگئے۔

رام۔ سیتا۔ اور لچھمن پنچوٹی کے بن میں امن و
امان کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ ایک دفعہ لچھمن جی
نے سروپ نکھا کے لڑکے کو اس کی غلط کاریوں کی
سزا کے طور پر قتل کر دیا۔ سروپ نکھا اس کی تلاش میں
جب یہاں پہنچی تو لچھمن جی پر لٹو ہوگئی اور انہیں شادی
کا پیام دیا۔ انھوں نے انکار کیا اور گستاخی کا مزا چکھایا تو
بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ راون کے ہاں پہنچکر سیتا جی کے
حسن و جمال کی تعریف کی اور اس کو آمادہ کیا کہ وہ سیتا کو
چُرا لے۔ راون پنچوٹی کے بن میں پہنچا اور ایک دن
موقع پاکر جبکہ رام ہرن پکڑنے اور لچھمن انھیں ڈھونڈنے
گئے سیتا کو اڑا لیا۔

رام اور لچھمن سیتا کی تلاش میں پھرنے لگے۔ آخر
کار ہنومان سے پتہ چلا کہ راون سیتا کو لنکا لیگیا ہے۔
نٹر نامی بن مانس کی مدد سے تین دن کے اندر سمندر
پر پل باندھا گیا اور رام چندر جی اپنے ساتھیوں کو لیکر
راون پر حملہ آور ہوئے۔ اور اس کو قتل کر کے سیتا کو
رہا کیا۔ لیکن عوام میں سیتا کے متعلق کانا پھوسی ہونے
لگی اور یہی دیکھکر سیتا نے اپنی عصمت کا ثبوت اس طرح
دیا کہ دھکتی ہوئی آگ میں برہنہ پا چلی گئی۔ جب لوگوں
کو اطمینان ہوا تو رام چندر جی سیتا اور لچھمن کے ساتھ
اجودھیا کو واپس ہوئے اور راج کرنے لگے۔ لیکن یہاں
بھی بعض لوگوں نے طعن کیا اور رام چندر جی نے لچھمن
جی سے کہا کہ چپکے سے سیتا کو جنگل میں چھوڑ آؤ۔

سیتا کو جنگل میں جب تنہا چھوڑ دیا گیا تو وہ حاملہ
بھی تھیں۔ والمیک کو ان کی حالت پر ترس آیا اور انھوں
نے انہیں اپنے آشرم میں رکھا۔ یہاں ان کے دو لڑکے
توام پیدا ہوئے جنکے نام لوکش رکھے گئے۔ اسی اثنا میں
رام چندر جی نے رسیو میدیگ کی رسم ادا کی اور ایک
گھوڑا زیورات سے لاد کر چھوڑ دیا اتفاقاً یہ گھوڑا اسی بن
میں آنکلا جہاں کہ سیتا اور لوکش رہتے تھے انجان
بالکوں نے گھوڑا روک لیا اور یہ نشانی تھی مقابلہ پر کمر کسنے
کی۔ حسب قاعدہ رام چندر جی اور لوکش میں مقابلہ ہوا۔ رام کو
شکست ہوئی اور لوکش انہیں گرفتار کر کے سیتا کے ہاں
لے آئے۔ والمیک نے انہیں رہا کیا اور وہ دونوں اپنی

راجہ ہانی کو جاکر پھر رسم ادا کرنے لگے کہ ناگہاں والمیک پہنچکر سارا حال کہہ سنایا کہ سیتا عفت کی دیوی ہے اور لوکش رام کے لڑکے ہیں۔ رام کا دل پسیجا اور انہوں نے سیتا اور اپنے لڑکوں کو احترام کے ساتھ واپس بلالیا۔

چار سیّاح

آج آمد و رفت کے ذرائع اتنے وسیع ہیں کہ متمدن ممالک کے بعض متمول نوجوان ماہ عسل گذارنے کیلئے دنیا کا چکر کاٹ لیتے ہیں لیکن کبھی وہ بھی زمانہ تھا کہ لوگ دور دراز کے ممالک سے واقف ہونا تو کجا اپنے ہمسایۂ سے ہی کماحقہ آگاہ نہ تھے جب متعدد ممالک اور بعض براعظم کا سرے سے علم ہی نہ تھا تو تاریخی۔ جغرافیائی اور معاشرتی حالات سے باخبر ہونا کیسا؟ اسی لاعلمی کو دور کرنے کے ارادہ سے دنیا کے مختلف گوشوں سے چند جانباز کمریں کس کر اُٹھے۔ وہ اپنے گرد و پیش سے واقف نہ تھے اور جہاں پہنچے ایک نئی دنیا آباد دیکھتے اس طرح ان کے تحیّر میں اور دنیا والوں کے علم میں برابر اضافہ ہوتا گیا یہی وجہ ہے کہ ان کے سفرنامے تاریخ کے ابتدائی صفحات میں جگہ حاصل کر چکے ہیں۔ ہم یہاں چار ایسے سیاحوں کا ذکر کریں گے جن کے نام زبان زد خاص و عام ہیں فاہیان نے چین سے ہندوستان کا سفر مذہبی مقامات کی زیارت کے ارادہ سے کیا لیکن اس نے جو چشم دید حالات اس زمانہ میں ہندوستان کے مختلف مقامات کے بیان کئے وہ تاریخ ہند کا ایک جزو ہو گئے۔ کولمبس نے امریکہ کو دریافت کر کے غیرفانی شہرت حاصل کر لی۔ واسکوڈی گاما نے ہندوستان کا نیا راستہ معلوم کیا اور ابن بطوطہ نے اس وقت کی معلومہ دنیا کا سفر کر کے اپنی ہمت و استقلال کا ثبوت دیا۔

فاہیان (۳۹۹ - ۴۱۴) ان دنوں کا ذکر ہے جبکہ گوتم بدھ کا اخلاقی اور مذہبی درس کا شہرہ ہندوستانی حدود کے باہر بھی پہنچ چکا تھا اور ہمسایہ ممالک اس تبلیغ کا اثر قبول کر رہے تھے چین میں بدھ مت کا پرچار بڑے زور و شور سے ہوا اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ اس روحانی درس کو قبول کرنے لگے۔ فاہیان ایک جوشیلا بدھ مت کا پرستار تھا اس نے ٹھان لی کہ ہندوستان پہنچ کر گوتم بدھ کی پیدائش اور رحلت کے مقامات مقدسہ کی زیارت کرے۔ حالانکہ ان دنوں سفر کے ذرائع قطعاً اس قابل نہ تھے کہ دشوارگذار اور ناقابل عبور گھاٹیوں سے گذر کے چین سے ہندوستان پہنچ سکے لیکن مذہبی جوش اندھا ہوتا ہے اور اسی سبب سے فاہیان کے آگے مشکل اور آسان کا سوال ہی نہ تھا۔

مملکت سن دارالخلافہ سی گان فرن کیلئے مذہبی جوش کے ساتھ تلاش حقائق سے اس نے اپنا سفر شروع کیا۔ راستہ میں " دیوار چین " کا سامنا کرنا پڑا۔ اسکو عبور کر کے اس ریگستان سے گذرنا پڑا جہاں تپتی ہوئی ریت کے میدان کے سوا حد نظر تک کوئی شئے نظر ہی نہیں آتی۔ کھوتان پہنچکر اس نے دم لیا۔ اور یہیں سب سے پہلے اس نے بدھ مت کا ایک میلا دیکھا

اور اس سے بہت متاثر بھی ہوا۔ اس نے بنارس کا رخ کیا تا کہ اس کے شمال مغرب میں جو مقام گوتم بدھ کی پیدائش کا ہے اس کی زیارت سے مشرف ہو۔ راستے میں اس نے گنگا کی وادیوں میں بدھ مت کا چرچا دیکھا اور بعض مقامات پر تو اسے یہ معلوم کرکے بے انتہا خوشی ہوئی کہ گوتم بدھ سے زیادہ یہاں کسی اور کی سیوا نہیں ہوتی پٹنہ اور اس کے قرب وجوار میں بعض مشہور ترین درسگاہیں اور خانقاہیں تھیں جہاں لاکھوں کی تعداد میں لوگ روحانی درس حاصل کرتے تھے۔

تقریباً پانچ سال تک وہ پٹنہ گیا، اجودھیا اور بنارس کے قرب وجوار میں رہا اور اس وقت کے بادشاہ چندر گپت ثانی کے دربار میں بھی حاضر ہونیکا اس کو بارہا موقع ملا اور جو کچھ اس نے آنکھوں دیکھے واقعات قلمبند کئے وہ اس زمانہ کی مستند تاریخ سمجھے جاتے ہیں۔ سارے مقدس مقامات کی زیارت کرکے اور بہت سی متبرک کتابیں جمع کرکے وہ لنکا ہوتا ہوا وطن واپس ہوا۔

ابن بطوطہ ابو عبداللہ محمد المعروف بہ ابن بطوطہ ۱۳۰۴ء میں بہ مقام طنجہ پیدا ہوا۔ وہ اپنی ۲۹ سالہ سیاحت عالم کیوجہ سے نہ صرف مسلمانوں کا سب سے بڑا سیاح مانا جاتا ہے بلکہ دنیا کے مشہور ترین سیاحوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس کا اس قدر طول طویل سفر خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ذرائع سفر بالکل محدود تھے نہایت حیرت انگیز ہے۔ اس باہمت اور بے باک سیاح نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اس وقت کی معلومہ دنیا کی سیاحت کرے اور جہاں تک اس کے امکان میں تھا اس نے اس کو پورا بھی کیا۔ ان دنوں لوگوں کا علم صرف یورپ، ایشیا، اور افریقہ تک ہی محدود تھا اور انہیں کو دنیا تصوّر کیا جاتا تھا۔

طنجہ مراکشی سواحل اطلانتک پر ہسپانیہ کے روبرو واقع ہے اس زمانہ میں ہسپانیہ کا ایک حصہ مسلمانوں کے قبضہ میں تھا لیکن مسلمانوں اور عیسائیوں میں جنگ وجدال کا بازار گرم تھا۔ ابن بطوطہ سلطنت اندلیسیہ کی طرف سے لڑنے کے لئے فوج میں شریک ہو گیا۔ حسن اتفاق سے اس کی رسائی قسطنطینہ تک ہوگئی اور اس نے اس شہرہ آفاق شہر کی مسلمانوں کے قبضہ میں آنے سے ایک صدی قبل خوب سیر کی۔ وہاں سے خازن پہنچا پھر اسکیمو ہوتا ہوا افریقہ کے بیشتر حصہ اور متوسط اور مغربی سوڈان کی سیاحت کی۔

ابن بطوطہ کی ایشیائی سیاحت کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ عرب ہونیکی حیثیت سے اُسنے عربستان کا ذکر زیادہ وضاحت سے کیا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی پانچ مرتبہ زیارت کی۔ دمشق۔ شام۔ ایران ایشیائے متوسط اور ترکستان کی سیر کرتے ہوئے ہندوستان آیا اور یہاں تقریباً بارہ سال گذارے محمد تغلق کے زمانہ میں سات سال تک دہلی کے قاضی کی حیثیت سے ملازمت کی اور بعد ازاں جنوبی ہند کی سیاحت کرتے ہوئے دریائی راستہ سے چین کا رُخ کیا۔ پیکنگ میں اس وقت غالباً سیاسی انقلاب کی گرم بازاری تھی جس کی وجہ سے وہ زیادہ نہ ٹھہر سکا اور واپس ہونے پر مجبور ہوا۔

۱۳۸۷ء میں اس کا انتقال ہوا۔

کولمبس

(۱۴۵۱ یا ۱۴۴۶ تا ۱۵۰۶ء) کرسٹوفر کولمبس ۱۴۴۶ء یا ۱۴۵۱ء کو بمقام جنیوا پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد وہ "پے ویا" کی یونیورسٹی کو بھیجا گیا جہاں اس نے نجوم۔ اقلیدس اور دوسرے علوم حاصل کئے اور وہ ابھی چودہ برس ہی کا تھا کہ جہاز رانی سے اسے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوگئی۔

۱۴۷۶ء میں اس نے انگلستان کا رخ کیا اور ۱۴۷۷ء میں "آئس لینڈ" کا سفر کیا۔ ۱۴۷۸ء میں وہ پرتگال واپس ہوا اور یہیں اُسنے "فلپا" نامی ایک معزز گھرانے کی لڑکی سے شادی بھی کرلی۔ اسی اثناء میں اسے سیاحت کا شوق بے چین کرنے لگا تھا وہ چاہتا تھا کہ نامعلوم ممالک دریافت کرے خصوصاً ہندوستان پہنچنا اس کا مقصد اولین تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوستان اطالیہ کے مغرب میں واقع ہے۔ اس لئے اگر وہ مغربی سمت کو گیا تو ہندوستان پہنچنا یقینی ہے۔

جنیوا والوں کو اس کے سفر سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس لئے وہ پرتگال کے بادشاہ سے مدد کا خواستگار ہوا۔ بادشاہ کو اس کے خیال سے دلچسپی ضرور تھی لیکن وہ اس کی مدد کی بجائے اپنے آدمی بھیجنا چاہتا تھا۔ کولمبس کو جب یہ حال معلوم ہوا اس نے انگلستان کے بادشاہ سے مدد مانگی۔ یہاں سے جب کوئی جواب نہ ملا تو وہ ہسپانیہ پہنچا اور ایک امیر سے راہ و رسم پیدا کرلی لیکن بدقسمتی سے ان دنوں ہسپانیہ اور موروں میں جنگ ہو رہی تھی اس لئے بادشاہ کے حضور میں اس کو باریابی حاصل کرنے میں بہت دیر ہوئی جب وہ تنگ آکر فرانس جانے لگا تو ہسپانیہ کی ملکہ کو اس کی خبر ہوئی اور اس نے فوراً ہی حکم دیا کہ تین جہاز تیار کرکے کولمبس کے حوالے کئے جائیں۔

اس نے اپنا عجیب و غریب سفر جمعہ کے دن ۳ اگست ۱۴۹۲ء کو شروع کیا جبکہ اس کی عمر ۴۶ سال کی تھی۔ اس نوعیت کا سفر اس سے پہلے کبھی کسی نے نہیں کیا تھا اسلئے اس کے ساتھی ملاح بہت ہراساں اور پریشان تھے لیکن کولمبس ایک ذہنی ارادے کا انسان تھا ایک منٹ کے لئے بھی اس کے دل میں واپس ہونے کا خیال نہیں آیا اور آگے بڑھتا گیا۔ دو مہینہ اور ایک ہفتہ اسیطرح گذر گئے ۱۱ اکتوبر ۱۴۹۲ء کی رات تھی

کولمبس

اور دس بجے کا وقت تھا کہ اس نے دور بہت دور روشنی کی ایک جھلک دیکھی۔ اسے فوراً ہی زمین کا گمان ہوا اور دوسری صبح معلوم ہوا کہ اس کا گمان بالکل صحیح تھا کنارہ پر پہنچکر کولمبس نے اپنا بہترین لباس زیب تن کیا اور اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ ساحل پر قدم رکھا۔ پہلے خدا کا شکر ادا کیا پھر ہسپانیہ کا جھنڈا ہوا میں لہرایا۔

چونکہ اس کو یقین تھا کہ یہ ہندوستان ہے اس لئے اسکو مغربی ہند اور یہاں کے سرخ لوگوں کو سرخ ہندوستانی کہنا شروع کیا۔

اس کے بعد ہی اس نے "کیوبا" نامی ایک جزیرہ دریافت کیا اور یہاں بعض ساتھیوں کو چھوڑ کر ہسپانیہ کا رخ کیا۔ ہسپانیہ میں اس کا بڑا پر جوش خیر مقدم کیا گیا۔ اس نے دو اور سفر کئے اور متعدد جزیرے دل کو دریافت کیا۔ اس کے کارناموں نے ایک ہلچل سے ڈالدی اور اس کا شہرہ اتنا ہوا کہ بیان سے باہر لیکن اسی شہرت نے اس کے مخالفین کو سخت سے سخت ترین دشمن بنا دیا۔ وہ اسی فکر میں رہنے لگے کہ کسیطرح اسے نقصان پہنچے۔ زمانہ کس کا ساتھ دیا ہے جو کولمبس کا ساتھ دیتا۔ بالاخر اس کے دشمنوں کو موقع ملا اور انہوں نے اسپر جھوٹے الزام قائم کئے اور بڑی تکلیف پہنچائی۔ اور اسی انتہائی مصیبت و افلاس کے عالم میں اس کا انتقال ۱۵۰۶ء میں ہوا۔

واسکوڈی گاما (۱۴۶۰ - ۱۵۲۴ء)

پرتگالیوں کا خیال تھا کہ کولمبس نے مغربی سمت سفر کر کے ہندوستان معلوم کیا۔ لیکن وہ چاہتے تھے کہ مشرقی سمت سے وہ دوسرا راستہ معلوم کریں۔ اس سلسلہ میں انہیں افریقہ کو پورا عبور کرنا پڑتا تھا۔ حالانکہ "ڈیاز" نامی ایک دلیر ملاح نے یہ معلوم کیا تھا کہ ساحل افریقہ گو طویل ضرور لیکن لا انتہا ہی نہیں اس کا ختم ہونا ضروری ہے اور جہاں یہ ختم ہوا وہیں سے ہندوستان کا نشان ملیگا لیکن ایک عرصہ دراز تک کسی کی ہمت نہوتی تھی کہ میدان عمل میں قدم رکھے۔ آخر جب "ایمانیول" بادشاہ کا زمانہ آیا تو اس نے اپنے ایک درباری کو جہاز دے کر اس مہم پر روانہ کیا۔ یہ درباری "واسکوڈی گاما" تھا۔ ۹ر جولائی ۱۴۹۷ء کو اس نے اپنا سفر شروع کیا۔

سفر کی طوالت سے اس کے ساتھی گھبرانے لگے لیکن واسکوڈی گاما نے کہا "میں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ اپنا قدم اب ہندوستان ہی کی زمین پر رکھوں گا چاہے اس میں مجھے کتنی ہی تکالیف کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے"۔ اسپر بعض بزدل اشخاص نے اسکے قتل کی سازش کی لیکن عین موقع پر اس نے سب باغیوں کو گرفتار کر لیا۔

۲۰ مئی ۱۴۹۸ء کو اسے ہندوستانی ساحل نظر آیا اور وہ کالی کٹ پر اترا۔ ستمبر ۱۴۹۹ء کو وہ پرتگال واپس ہوا۔ جہاں اسکی خدمات کو خوب سراہا گیا۔

واسکوڈی گاما

۱۵۰۲ء میں وہ دوبارہ ہندوستان بھیجا گیا اور اسے امیر البحر کا اعزاز دیا گیا۔ ایک سال بعد اسنے

اپنے جہازوں کو ہندوستانی تحائف سے لاد کر وطن کا رخ کیا۔ اس دفعہ اسکی اور بھی عزت کی گئی اور خاص طور پر اسے بادشاہ نے اپنا مشیر بنایا۔ ۱۵۱۹ء میں اسکو "کاؤنٹ" کا عہدہ ملا اور خاص عنایات و مراعات سے سرفراز کیا گیا۔

سترہویں صدی کے مشہور مُصلح تعلیم

مُصلحانِ تعلیم کی زندگی قوم و مُلک کے عام رجحان کو بدلنے میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اُن کے خیالات کا اثر تعلیمی دنیا پر اثر انداز ہو کر افراد یعنی سماج کے لئے ایک مخصوص لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ اور سماج کی ترقی اُن کے اعلیٰ خیالات کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔

تیرہویں صدی کے مُصلحان تعلیم میں کامی نیس اور لاک کا نام خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اُن کے خیالات نے تعلیمی دنیا میں ایک نیئے باب کا اضافہ کیا بلکہ یوں کہنا چاہیئے اُنہوں نے عصرِ حاضر کے تعلیمی خیالات کی بنیادیں رکھیں۔

کامی نیس (۱۵۹۲ - ۱۶۷۰ء)

کامی نیس سورا ویا کے ایک گاؤں نیونسز میں پیدا ہوا۔ مذہب کا پروٹسٹنٹ اور فرقہ موراوین برتھرن کا پیرو تھا۔ بچپن ہی میں ماں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اسی باعث وہ لاطینی زبان جو اس زمانہ میں اہل علم کی زبان سمجھی جاتی تھی، سیکھنے سے محروم رہا، اس کی یہ بدقسمتی اُس کے حق میں مفید ثابت ہوئی۔ اُس کی اعلیٰ تعلیم جامعہ ہیڈبرگ اور لوتھرن کالج آف ہربارن میں ہوئی۔ اس کے بعد اُس نے پادری کی خدمت انجام دی۔

یورپ کی سی سالہ جنگ کے زمانہ میں وہ پولستانی شہر لیسنو میں تھا، یہاں اُس نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ اِس کی پہلی تصنیف "فتح باب الالسنہ" ہے اِس کتاب پر قدیم مصلحان تعلیم راٹکے اور اُس سے زیادہ تبیس کا اثر ہے اُس میں ایک طرف لاطینی ہے اور دوسری طرف جرمن زبان میں ترجمہ۔ اِس کتاب کے بعد اُس نے "وسٹی بیلم" کتاب پہلی کتاب کے دیباچہ کے طور پر لکھی۔ اُس نے اپنی ایک دوسری کتاب "دنیائے تصاویر" Orbis pictus میں اشیاء اور الفاظ کو تصویروں کے ذریعہ سمجھایا ہے۔ اُس نے اپنے تعلیمی خیالات کو اپنی مشہور کتاب "اصول تعلیم" Great Didactic میں پیش کیا ہے۔ کامی نیس ہر جہتی تعلیم کا حامی تھا اسی لئے اُس نے ایک کتاب Janna Rerum Reserta لکھی جو بہت مشہور

کامی نیس

ممتاز، باقاعدہ اور مکمل ہے۔

کامی نیس بھی لوتھر کی طرح اپنے خیالات کو ساری دنیا کے کانوں تک پہنچانا چاہتا تھا جو یہ ہیں:۔

(۱) انسان تمام مخلوقات میں سب سے اعلیٰ اشرف اور مطلق ہے۔

(۲) انسان کا مقصد اعلیٰ اُس زندگی سے پڑے ہے

(۳) یہ زندگی اَبدی زندگی کی تیاری ہے۔

(۴) اَبدی زندگی کی تیاری کے تین دور ہیں (۱) خود شناسی (۲) خود ضبطی اور (۳) خدا شناسی۔

(۵) یہ تینوں یعنی اکتساب، نیکی اور مذہب ہم میں ودیعت کئے ہوئے ہیں۔

(۶) اگر اِس قسم کا اِنسان بنانا مقصود ہو تو تعلیم ہی کے ذریعہ یہ کام سرانجام پاسکتا ہے۔

اِس طرح سے علم، اخلاق، اور زہد کامی نیس کی تعلیم کے تین مخصوص پہلو تھے۔ اِن تینوں میں گہرا تعلق بتلا کر اُس نے قرونِ وسطیٰ کے مذہبی نقطۂ نگاہ کو بدل دیا وہ کہتا ہے کہ علم اور تعلیم سے نہ صرف انسان اپنے پر قابو پاکر نفس کو آزاد کرتا ہے بلکہ اس سے مذہب کی تکمیل بھی ہو جاتی ہے۔

کامی نیس تعلیم میں طریقہ فطرت پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تعلیم میں فطرتی پہلو کو نظر انداز کیا جائے تو وہ نامکمل رہے گی۔ اسی باعث اُس نے بچوں کی فطری قوتوں پر زور دیا۔ اور سب سے پہلے مطالعہ اطفال کی اہمیت کو واضح کیا۔ اس کے علاوہ کامی نیس نے اس امر پر بھی زور دیا کہ تعلیم میں مذہب و ملت، صنف اور اقتدار کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے، سب برابر کے حقدار ہیں۔ غرض کامی پہلا مصلح تعلیم ہے جس نے مدارس کا ایک باقاعدہ نظام پیش کیا، مدرس کی اہمیت جتلائی، عام تعلیم کی تبلیغ کی، جسمانی تعلیم کی اہمیت کو واضح کیا۔ مادری زبان کو لاطینی زبان پر فوقیت دی، جغرافیہ، تاریخ اور دیگر تمام علوم کے ابتدائی مسائل پر جو انسانی زندگی کے لئے کارآمد تھے توجہ دی، تمام مضامین کے درمیان باہمی ارتباط پیدا کیا اور ہر چیز کو حقیقی طور پر پیش کرنے کی ہدایت کی۔ اسی باعث وہ "حقیقیتی تحریک" کا بانی کہلایا جاتا ہے۔ تعلیمی دنیا پر کامی نیس کا گہرا اثر ہوا اور آج اس کے خیالات ہمارے موجودہ تعلیمی نظریوں کی اساس ہیں۔

لاک سترہویں صدی عیسوی کا دوسرا زبردست مصلح تعلیم لاک ہے۔ لاک انگلستان میں سومرسٹ نامی مقام پر ایک شریف گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کی ابتدائی تعلیم ایک پیوریٹیان پادری کے پاس ہوئی، بعد میں اسے وسٹ منسٹر مدرسہ اور پھر آکسفورڈ میں شریک کیا گیا۔ دورانِ تعلیم میں اُس پر بیکن اور ڈیکارٹ کا گہرا اثر ہوا۔ فلسفہ سے اسے خاص شغف تھا۔

اس زمانہ میں مدرسیّت کا بہت دور دورہ تھا لاک چونکہ بہت آزاد خیال تھا اِس لئے مدرسیت کی موضوعیت اور آکسفورڈ کی قدامت پسندانہ زندگی اسے سخت ناپسند ہوئی۔ اُس کی مشہور کتاب Essays on Human understanding "مضامین بہ فہم انسانی" میں اُس کے آزاد خیالات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

لاک قلم کا دھنی تھا۔ اُس نے علم کے مختلف شعبوں میں کتابیں لکھی ہیں جو آج بھی بہت وقعت سے دیکھی جاتی ہیں۔ خیالات تعلیمی Thoughts on Ed ایک تعلیمی کتاب ہے

Treatise on Govt سیاسی خیالات کی حامل ہے۔ اِس میں اُس نے آزادی کا راگ الاپا ہے۔ مذہب پر اُس کی کتاب Letters on Toleration بہت دلچسپ ہے۔ اِس میں وہ انفرادی آزادی کی موافقت کرتا اور مذہبی پیشواؤں کے بیجا اقتدار اور شخصیت کو ناجائز تصور کرتا ہے۔ اُس کی فلسفیانہ کتاب "مضامین بہ فہم انسانی" فلسفہ کی دنیا میں بڑی وقعت رکھتی ہے اُس کا ضمیمہ Conduct of under- ایک خاص اہمیت کی تصنیف ہے۔

لاک کی تعلیمی کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ مانٹین کی طرح وہ بھی انسانیاتی اور سماجی حقیقت کا پیرو تھا، کامی نیس کی طرح حسی حقیقت سے بھی تھوڑا بہت لگاؤ رکھتا تھا۔ اُس کے خیال میں کتابی تعلیم اور ذہنی تربیت اِتنی زیادہ اہم نہ تھی جتنی کہ کردار کی نشوونما اور تشکیل۔ حسی حقیقت کے طرفداروں کی طرح لاک بھی مادری زبان میں تعلیم دینے کے اُصول کو بہت پسند کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مادری زبان پر عبور حاصل ہونے کے بعد غیر زبانوں سے وہ زبان پہلے لی جائے جو مادری زبان سے ملتی جلتی ہو۔ مثلاً انگریز بچے کے لئے فرانسیسی۔ لاک زبان کے ساتھ دیگر مضامین کے ارتباطِ باہمی پر بھی زور دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ حساب، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ کو زبان کے سلسلہ میں پڑھانے سے ایک تو زبان بھی آجائیگی اور دوسرے مضامین کی بھی تکمیل ہوتی جائیگی۔

تاریخ تعلیم میں لاک کی اہمیت "موضوعی تربیت" کے علمبردار کی حیثیت سے بہت زیادہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نفس ایک سادہ تختی ہے جس پر تاثرات کے مرتسم ہونے سے عادات بنتی ہیں۔ اِس طرح وہ ذہنی تربیت پر شدت سے زور دیتا ہے اور ریاضی کو استدلال کے لئے بہت مفید گردانتا ہے۔

جسمانی تربیت کے متعلق لاک کا خیال ہے کہ "بچہ کے قویٰ اکثر نزاکت اور ناز و نعم کے باعث یا تو بالکلیہ کمزور ہو جاتے ہیں یا اس سے سخت نقصان پہنچتا ہے سب سے پہلی بات یہ کہ چاہے گرما کا موسم ہو یا سرما کا، بچوں کو بہت زیادہ گرم نہ رکھا جائے۔ جس وقت بچہ پیدا ہوتا ہے اس کا چہرا سب سے زیادہ نازک اور حساس ہوتا ہے لیکن عادت سے اُس میں سردی اور گرمی برداشت کرنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بچہ کے پیر روزآنہ سرد پانی سے دھوئے جائیں اور اُس کا جوتا اِس قدر پتلا ہو کہ پانی اندر آسکے۔ بغیر ٹوپی کے بچہ کو دھوپ اور ہوا میں کھیلنے دیا جائے۔ اُس کی غذا بہت ہی سادہ اور معمولی ہونی چاہیئے۔ اگر گوشت کی ضرورت ہو تو مہینہ میں صرف ایک مرتبہ دیا جائے اُن کا بستر نرم اور پشمینہ دار نہ ہو"

یہ لاک کا اُصول **قوت برداشت** ہے۔

لاک کا یہ اصول آج تعلیمی دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ اِن مسلمہ اصولوں کی پابندی کیوں نہیں کی جاتی۔

سترہویں صدی کے اِن دونوں مصلحین کا تعلیماتی دنیا پر گہرا اثر ہے۔ ان کے اکثر و بیشتر اصول آج قابلِ عمل ہیں۔

ہماری پلکیں کیا کام انجام دیتی ہیں؟

اِس سوال کا جواب بہت آسان ہے لیکن اکثر بڑی عمر کے لوگ بھی اس سے ناواقف ہیں۔ پلکوں کے وجود کے دو وجوہ ہیں۔ ایک تو ان کا استعمال اور دوسرے حسن۔ اگر پلکیں نہ ہوتیں تو گرمی کے باعث پیشانی پر جو پسینہ آجاتا ہے اس کے قطرے آنکھوں میں گرجاتے اس سے ایک تو آنکھوں میں دھندلاپن پیدا ہوجاتا ہے اور دوسرے پسینہ درحقیقت ایک زہریلی چیز ہے۔ ہماری پلکیں ان قطروں کو آنکھوں میں جانے سے باز رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ آنکھیں ہمارے چہرہ کا سب سے زیادہ خوب صورت حصہ ہیں اور پلکیں ان کی رونق کو دوبالا کرتی ہیں۔

کیا پودے سوتے ہیں؟

نیند میں بیرونی دنیا کا شعور غائب ہوجاتا ہے سونے والا باہر کی چیزوں کو دیکھ اور سن نہیں سکتا۔ اگر کوئی گہری نیند میں ہو تو اسے بندوق کی آواز اور بادل کی گرج بھی سنائی نہیں دیتی۔ پودے ایسی نیند نہیں سوتے کیونکہ ان میں بصارت اور سماعت کے حس مفقود ہوتے ہیں۔ لیکن نیند کی تعریف میں محض نہ دیکھنا اور نہ سننا ہی داخل نہیں بلکہ کام کے بعد آرام بھی نیند میں داخل ہے۔ اس نقطۂ نظر سے پودے کم و بیش مختلف اوقات میں سوتے ہیں۔

سرما میں پودے بہ نسبت گرما کے کم کام کرتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ سو رہے ہیں۔ سبز پودے جن کے پتے جھڑ گئے ہوں وہ بھی زیادہ کام نہیں کرتے کیونکہ سبز پتیوں کے بغیر وہ نہ نشاستہ بنا سکتے ہیں، نہ شکر نہ ریشے، نہ کونپل، نہ کلی، نہ پھول، اس کا مطلب یہ نہیں کہ پودا مر چکا۔ وہ زندہ ہے لیکن وہ کام کر رہا ہے اور نہ زندہ ریشے بنا رہا ہے۔ بلکہ وہ سو رہا ہے۔

پودے دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں تھوڑا بہت سو جاتے ہیں۔ سورج کی روشنی میں وہ کام کرتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کی تحلیل کر کے کاربن حاصل کرتے اور کاربن سے شکر، نشاستہ اور دوسری ضروری اشیاء تیار کرتے ہیں۔ لیکن سورج کے غروب ہوتے ہی یہ سب کیمیائی تعاملات بند ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ہم کہہ سکتے ہیں کہ پودا سو رہا ہے۔

پتے جب بند ہو جاتے ہیں تو پودے سوتے ہیں لیکن بعض پودوں کے پتے رات کو کھلے رہتے ہیں ایسے پودے گویا اپنی آنکھیں کھلی رکھکر سوتے ہیں۔

اسپی طاقت Horse-power سے کیا مراد ہے؟

موٹر، موٹر سیکل اور دیگر مشینوں کی طاقت کو اسپی طاقت میں بیان کرتے ہیں مثلاً ۳ اسپی طاقت، ۱۰ اسپی طاقت وغیرہ۔ اسپی طاقت کو گھوڑے کی طاقت سے کوئی خاص واسطہ نہیں ہے بلکہ اس اصطلاح کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آج سے کوئی ایک صدی قبل جیمس واٹ James watt نے چند گھوڑوں پر تجربہ کیا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اچھا گھوڑا اوسط حالت میں کس قدر کام کر سکتا ہے۔ اس تجربہ سے اسے ایک خاص عدد ۵۵۰ فٹ پونڈ فی ثانیہ یا ۳۳۰۰۰ فٹ پونڈ فی منٹ حاصل ہوا۔ اس سے مراد وہ طاقت ہے جس سے ۵۵۰ پونڈ کا وزن ایک ثانیہ میں ایک فٹ تک اُٹھایا جا سکتا ہے۔ اس طاقت کا نام واٹ نے ایک اسپی طاقت رکھا۔ عام طور پر بلکہ اچھے گھوڑوں سے مسلسل اس طاقت کے کام کی توقع رکھنا فضول ہے کیونکہ گھوڑوں کو چابک ماریں تو وہ زیادہ کام کرتے ہیں لیکن تھوڑے عرصہ کے لئے۔ وہ کسی مشین کے کل پرزوں کی طرح ہمواری کے ساتھ کام نہیں کر سکتے۔ واٹ کا نتیجہ ایک تقریبی اوسط ہے۔ اسپی طاقت کی اکائی عام طور سے استعمال کی جاتی ہے اور مشینوں کی طاقت کو اسی میں بیان کیا جاتا ہے۔

اسپی طاقت کے علاوہ برقی اسپی طاقت بھی استعمال ہوتی ہے۔ اس کی قیمت ۷۴۶ واٹ ہے۔ ایک واٹ سے طاقت کی وہ مقدار مراد ہے جو ایک وولٹ دباؤ کے تحت بہنے والی ایک ایمپیئر رو سے حاصل ہوتی ہے۔

کتا اجنبی کو کس طرح پہچانتا ہے؟

کتے کی آنکھ بڑی تیز ہوتی ہے اور اس سے زیادہ اس کی قوت شامہ بہت حساس ہوتی ہے۔ وہ اجنبی کی مخصوص بُو کو فوراً محسوس کر لیتا ہے۔ اگر اجنبی کتے کے آقا کے کپڑے پہن لے تو کتا صورت کے اختلاف کو اتنا محسوس نہ کر سکے گا اور اپنے آقا کے کپڑوں کی بُو سے اسے آقا سمجھکر دھوکا کھا جائیگا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد وہ بھینی سی محسوس کریگا اور سمجھے گا کہ اسے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔

جانور بالعموم اپنی حس شامہ پر اعتبار کرتے ہیں اور ہم اپنی حس بصارت پر۔ حس شامہ کے علاوہ کتے کا حافظہ بہت اچھا ہوتا ہے اور عرصہ تک وہ بُو کو یاد رکھ سکتا ہے۔

ہماری ہاتھ پر لکیریں کیوں ہوتی ہیں؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہاتھ کی لکیریں اشیاء کی گرفت میں مدد دیتی ہیں۔ درست ہے لیکن اس سے زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ ان لکیروں کے باعث ہاتھ کی سطح

کا رقبہ بڑھ جاتا ہے جس سے اس کی حساسیت بڑھ جاتی ہے اسی وجہ سے ہم ہلکی سی کھُردری سطح کو اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔ ہاتھ کی لکیروں پر حس لامسہ کے اعصاب کے ننھے ننھے سرے ختم ہوتے ہیں جس سے ہمیں بہت فائدہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ یہ ایسی جگہ ہے جہاں حساسیت کی زیادہ ضرورت ہے۔

ہلکے اور بھاری پانی میں کیا فرق ہے؟

بھاری پانی میں چند نمک ہوتے ہیں اور ہلکے پانی میں نہیں۔ یہ نمک بالعموم کیلشیم دھات کے نمک ہوتے ہیں جنھیں پانی زمین سے حاصل کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بارش کا پانی جو راست برتنوں میں جمع کیا جائے ان نمکوں سے بے نیاز ہوگا۔ اسی لئے وہ ہلکا پانی ہے۔ گو بھاری پانی پینے کے لئے بہت عمدہ ہوتا ہے تاہم قابل اعتراض بات یہ ہے کہ صابن سے اس کی نباہ مشکل ہے' اس لئے بھاری پانی شوئی کاموں کے لئے ناموزوں ہے۔

جب صابن بھاری پانی سے ملتا ہے تو ایک طرح کا کیمیائی تعامل واقع ہوتا ہے اور ایک ایسی چیز حاصل ہوتی ہے جو پانی میں حل نہیں ہوتی برخلاف اسکے ہلکے پانی میں صابن اچھی طرح حل ہوتا ہے اور کف بھی خوب نکلتا ہے۔ اسلئے دھونے کے لئے ہلکا پانی مفید ہے۔ ہلکے اور بھاری پانی کی آسان پہچان یہ ہے کہ جس پانی میں صابن کا کف آسانی سے نکلے وہ ہلکا ہے ورنہ بھاری۔

کیا بھاری پانی ہلکا کیا جا سکتا ہے؟

بھاری پانی کو ہلکا کیا جا سکتا ہے۔ بھاری پانی میں بالعموم کیلشیم بائی کاربونیٹ ہوتا ہے۔ اگر اس پانی کو جوش دیا جائے یا اس میں چونے کا پانی ملایا جائے تو اس سے کیلشیم بائی کاربونیٹ' کیلشیم کاربونیٹ میں تبدیل ہو کر علیحدہ ہو جائیگا اور پانی ہلکا ہوگا۔ بھاری پانی میں کیلشیم کے بائی کاربونیٹ کے علاوہ اور بھی مرکبات شریک ہوتے ہیں جن کے باعث پانی محض جوش دینے یا اس میں چونے کا پانی ملانے سے ہلکا نہیں ہو سکتا۔ ایسے پانی کو مستقل بھاری پانی اور اول الذکر کو عارضی بھاری پانی کہتے ہیں۔ مستقل بھاری پن کو دور کرنے کے لئے اس میں کپڑے دھونے کا سوڈا ملاتے ہیں۔

گائے دودھ کس طرح دیتی ہے؟

جسم کے بعض حصے ایسے ہوتے ہیں جن سے وہ اشیاء پیدا ہوتی ہیں جن کی جسم کو ضرورت ہے' انہیں غدود کہتے ہیں۔ غدود جسم کے کیمیا گر ہیں۔ یہ کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض خون سے غیر ضروری اجزاء کو تقطیر کے ذریعہ خارج کر دیتے ہیں۔ جلد میں بھی اس قسم کے غدود ہوتے ہیں جو پسینہ کو خارج کرتے ہیں کان کے سامنے نیچے کی طرف جو غدود ہوتے ہیں اور جن کے پھولنے سے Mumps ہو جاتے ہیں' وہ ایک طرح کا لعاب تیار کرتے ہیں جو کھانا کھاتے وقت ہمارے منہ میں پیدا ہوتا ہے اور غذا کو ملائم کرکے ہضم کرتا ہے۔

غدود کئی طرح کے ہوتے ہیں اور بعض تو بہت ہی مفید اور کارآمد بھی ہوتے ہیں۔ گائے پستانی جانوروں کے تھن اور عورتوں کے پستان میں ایک قسم کے

غدود ہوتے ہیں جن کا کام خون کو دودھ کی شکل میں منتقل کرنا ہے۔ اگر ہم گائے کے تھن کا باریک بینی سے مطالعہ کریں تو ہمیں بہت سی چھوٹی چھوٹی عروق (رگیں) دکھائی دینگی اور ان میں خون دوڑتا ہوا نظر آئے گا۔ اس خون سے غدود بعض ضروری اجزا حاصل کرکے دودھ بناتے ہیں۔ جسم حیوانی کے اس انتظام سے قدرت کی محبت مادری کا پتہ چلتا ہے!

کبوتر اپنا راستہ کس طرح تلاش کرتے ہیں؟

یہ مسئلہ عرصہ دراز تک حیران کن رہا کہ اگر کبوتر کو بند صندوق میں رکھکر بھی ایک مقام سے دوسرے مقام تک لیجایا جائے تو وہ پھر کس طرح اپنے مقام پر واپس آسکتا ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کبوتر اپنی بصارت کی بدولت راستہ معلوم کرلیتا ہے۔ اس کی آنکھیں بڑی عجیب ہوتی ہیں جب وہ ہوا میں بہت بلندیوں پر پرواز کرتا ہے تو بہت دور تک اُسکی نظر کام کرتی ہے اور وہ آسانی سے اپنے مسکن کا پتہ لگا لیتا ہے۔ بعض دفعہ کبوتر اس کوشش میں ناکام بھی ہوتے ہیں اور جوان سے زیادہ بوڑھے اپنا گھر تلاش کرنے میں اُستاد ہوتے ہیں۔

بصارت کے علاوہ کبوتر کا حافظہ بہت زبردست ہوتا ہے، خصوصاً مقامی حافظہ، جس کے باعث وہ محض چند مقامات کو دیکھکر ان کے حوالہ سے اپنے مسکن کی راہ معلوم کرلیتا ہے۔ علاوہ ازیں کبوتروں میں سمت کا احساس بھی اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ بعض دوسرے جانور بھی کم وبیش اس صفت سے متصف ہیں۔

کبوتروں کی اس صلاحیت کے مدنظر قدیم زمانہ میں جبکہ ذرائع حمل ونقل محدود تھے، خطوط رسانی کا کام انہیں سے لیا جاتا تھا۔ اس زمانہ کی کبوتری ڈاک مشہور رہی ہے۔

کیا جانور فکر کرسکتے ہیں؟

اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر لفظ فکر کے معنیٰ کی وضاحت ضروری ہے۔ احساس کے معنیٰ تفکر کے نہیں ہیں۔ اسی طرح تفکرات یا خیالات کو احساسات نہیں کہا جاسکتا۔ فکر سے مراد دو چیزوں کے درمیان رشتہ یا تعلق پیدا کرنا ہے۔ اور جب دو چیزیں باہم اس طرح مربوط ہوں تو اسے تفکر یا عام الفاظ میں خیال کہتے ہیں۔ بھوک لگنا ایک احساس ہے لیکن یہ کہنا کہ "مجھے بھوک لگ رہی ہے" تفکر ہے کیونکہ اس میں آپ نے اپنی بھوک کے ساتھ اپنے خیال کو مربوط کیا ہے۔ تفکر کے اس معنی کے لحاظ سے جانوروں میں تفکر کا مادہ بہت کم ہوتا ہے البتہ بعض اعلیٰ جانوروں مثلاً کتے میں تھوڑی بہت تفکر کی صلاحیت ہوتی ہے۔ بہرحال جانوروں میں تفکر مفقود تو نہیں تاہم اتنا کم ہوتا ہے کہ لحاظ کے قابل نہیں انسان اس صفت سے بدرجۂ اتم مالامال ہے۔

کیا جانور بات کرسکتے ہیں؟

بات کرنیسے مراد اپنے احساسات یا مافی الضمیر کو الفاظ کے ذریعہ بیان کرنا ہے بچہ مختلف قسم کی آوازیں نکالتا ہے۔ یہ بھی اس کی بات چیت ہے۔ لیکن جانور اس طرح سے بات نہیں کرتے۔ گو بعض جانور ہمارے باتوں کی من وعن نقل کرتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں وہ

بات کر رہے ہیں۔ حالانکہ جانوروں کے لئے یہ نقلی بات بے معنی ہے۔ جانوروں کے بات نہ کر سکنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دماغ انسان کے دماغ کے مقابلہ میں بہت پست رتبہ کے ہوتے ہیں۔ بعض جانور خواہ کسقدر ہی چالاک کیوں نہ ہوں اور انسان کی صحبت میں رہنے سے انہیں کتنی ہی تربیت کیوں نہ حاصل ہوئی ہو، وہ خاص خاص آوازوں کو خاص خاص معنی میں استعمال نہیں کر سکتے۔ جانوروں کا حلق، صوتی ڈبہ، زبان اور دہن سب انسان کا سا ہے لیکن ان کے دماغ انسانی دماغ کی صلاحیت سے محروم ہیں جس کے باعث وہ بات چیت سے مجبور ہیں۔

کیا ۱۳ کا عدد منحوس ہے؟

اس عدد کو منحوس کہنا حماقت ہے۔ یہ محض ایک وہم ہے۔ اسی طرح کے اور بھی توہمات ہیں۔ بعض لوگ ۲۸ اور ۸ کو بھی منحوس سمجھتے ہیں۔ اور ان تاریخوں میں کوئی نیک کام نہیں کرتے۔ انگریز بھی ۱۳ کو اس لئے منحوس خیال کرتے ہیں کہ ان کے خیال کے مطابق حضرت مسیحؑ کے آخری کھانے پر ۱۳ آدمی شریک تھے۔ عیسائی جمعہ کو منحوس گردانتے ہیں کیونکہ کہا جاتا ہے کہ جمعہ کو حضرت مسیحؑ کو سولی دی گئی تھی لیکن یہی جمعہ مسلمانوں کے ہاں نیک دن شمار ہوتا ہے۔ کالی بلی کا آڑے آنا، تیسری کا چاند دیکھنا، دمدار ستارے کا نکلنا وغیرہ اس قسم کے توہمات ہیں جو روزمرہ ہماری زندگی کا جزو بنتے جا رہے ہیں۔ اس موضوع پر اکثر لوگوں نے کافی تحقیق کر کے بتلایا ہے کہ ہماری زندگی پر توہمات کی اثر آفرینی اب سے نہیں بلکہ برس ہا برس سے ہے اور خصوصاً ایام جاہلیت میں ان کی فراوانی تھی۔ اب یہ کم بھی ہو گئے ہیں تو بھی بہت کچھ ہیں۔ ان پر اعتقاد رکھنا خدا کی قدرت اور مرضی کے خلاف ہے۔

انسان پر غشی کیوں طاری ہوتی ہے؟

غشی ایک بڑی دلچسپ چیز ہے۔ دل جب دماغ کو کافی مقدار میں خون نہیں بھیجتا تو اس کے کام میں سستی واقع ہوتی ہے اور شخص زمین پر گر جاتا ہے۔ ایسی صورت میں دماغ کو خون کی ضرورت ہے جب ہم کھڑے ہوتے ہیں یا بیٹھ جاتے ہیں تو دل کو خون کو جاذبہ زمین کے خلاف دماغ تک پہنچانا پڑتا ہے لیکن غشی کے بعد جب انسان گر جاتا ہے تو دل کو جاذبہ کے خلاف جو کام کرنا پڑتا تھا وہ گھٹ جاتا ہے اور تھوڑی دیر میں دماغ کو خون کی کافی مقدار مل جاتی ہے اور انسان اُٹھ بیٹھتا ہے۔ اس طرح سے گویا بیہوش آدمی کے گر کر لیٹ جانے میں قدرت کا ایک اہم راز پنہاں ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں وہ بیہوش آدمی کو قدرت کے منشاء کے خلاف اٹھا کر بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے اگر اسے لٹا کر اس کے پیر اُٹھائے جائیں تو مفید ہو گا کیونکہ دماغ کو خون کی زیادہ مقدار جلدی سے مل جائے گی۔

ہوا کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟

ہوا کئی گیسوں کا آمیزہ ہے اور یہ سب کی سب بے رنگ اور شفاف ہیں۔ ہوا میں بالخصوص دو گیسیں نائٹروجن اور آکسیجن موجود ہیں۔ ⅘ حصہ نائٹروجن ہے

اور بقیہ ۱/۵ حصہ آکسیجن۔ آکسیجن گیس بہت اہم ہے۔ اس پر ہماری زندگی کا دارومدار ہے۔ نائٹروجن گیس پودوں کی زندگی کی جان ہے۔ ان دو گیسوں کے علاوہ ہوا میں کچھ کاربن ڈائی آکسائیڈ بھی موجود ہے۔ یہ وہی گیس ہے جسے ہم سانس کے ذریعہ باہر چھوڑتے ہیں اور جسے پودے جذب کرتے ہیں اسکے علاوہ ہوا میں بخارات آبی اور بعض گیسوں کے شائبے پائے جاتے ہیں۔

کھلے میدانوں کی ہوا بہت صاف ہوتی ہے کیونکہ اس میں آکسیجن کا تناسب نسبتاً زیادہ ہوتا ہے لیکن بند کمروں، سینما گھروں اور ان مقامات پر جہاں لوگوں کا اجتماع زیادہ ہو، ہوا غلیظ ہوتی ہے کیونکہ اس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار نسبتاً زیادہ ہوتی ہے جو صحت کے لئے مفید نہیں۔ اس طرح شہروں کی ہوا بھی کاربن ڈائی آکسائیڈ کے باعث گندہ ہو جاتی ہے، اسلئے شہروں سے زیادہ دیہات یا کھلے مقام پر کی ہوا صحت کے لئے بہت اچھی اور مفید ہوتی ہے۔

کیا شہد کی مکھیاں پھولوں سے شہد حاصل کرتی ہیں؟

یہ فرض کرنا غلطی ہے کہ شہد کی مکھیاں پھولوں سے تیار شدہ شہد حاصل کرتی ہیں کسی پھول میں شہد نہیں ہوتا۔ شہد کی مکھیاں پھول سے کچھ مادہ حاصل کرکے شہد بناتی ہیں۔ پھول میں جو میٹھا مادہ ہوتا ہے وہ شہد نہیں ہے اور نہ اس کا مقصد مکھیوں کے لئے سامانِ ضیافت مہیا کرنا۔ پھول اس میٹھے مادہ کو خود اپنے لئے تیار کرتا ہے اور مکھیاں اس کے بنانے میں مدد دیتی ہیں۔ پھول میں اس مادہ کی تیاری کے لئے سورج کی روشنی اور پانی کی ضرورت ہے، ان کی وجہ سے اندر کیمیائی تعامل ہوکر یہ مادہ پیدا ہوتا ہے۔

زہر کیا چیز ہے؟

تمام زندہ مخلوق کا انحصار مائع جیسی ایک شفاف شئے پر ہے جسے نخز مائع کہتے ہیں۔ اس کو برباد کرنے والی شئے کا نام زہر ہے کیونکہ نخز مائع کے اتلاف سے زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ سب زہر یکساں اثرات نہیں رکھتے اور بعض زہر ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ کم اور مناسب مقدار میں استعمال کئے جائیں تو دوا کا کام کرتے ہیں۔ مثلاً پروزک ترشہ، سنکھیا، فاسفورس، الکحل، کلوروفام وغیرہ۔

زندگی کا انحصار سانس پر ہے۔ زہر سانس میں رکاوٹ پیدا کرتا اور جسم کے اندرونی فعل میں حارج ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ کئی طریقوں سے خون کی تکسید اور زندہ خلیوں کے تنفس میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے زہر تنفسی مرکز کا کام بند کرتے اور خون کے سرخ خلیوں کو آکسیجن سے محروم رکھتے ہیں جس کے باعث ان خلیوں کا دم گھٹ کر وہ مرجاتے ہیں۔

زہریلی اشیاء سے احتیاط ضروری ہے، معمولی سا زہر بھی اگر زیادہ مقدار میں استعمال کیا جائے تو مہلک ہے۔ پوٹاشیم سیانائیڈ اور ہر قسم کے سیانائیڈ بہت زیادہ مہلک زہر ہیں۔ اگر ان کا قطرہ بھی منہ میں چلا جائے تو جان بر ہونا مشکل ہے۔

حرارت کے اثر سے اشیاء ہمیں تھرتھراتی ہوئی کیوں نظر آتی ہیں؟

جب آنکھ اور شئے کے درمیان گرم ہوا کی رَوگذرتی

ہے تو شئے ہمیں تھرتھراتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بات یہ ہے کہ حرارت یا گرمی سے ایسا نہیں ہوتا بلکہ ہوا اور ہوا کی رطوبت پر حرارت کے اثر سے یہ واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ہوا گیسوں کا ایک آمیزہ ہے گیس بھی دیگر اشیاء کی طرح حرارت کے اثر سے پھیلتی ہیں اور ان کی کثافت گھٹ جاتی ہے یعنی پہلے ایک خاص حجم کی ہوا کا جو وزن تھا اب اسی حجم کی ہوا کا وزن پہلے کی بہ نسبت ہلکا ہو جاتا ہے یعنی وہ لطیف ہو جاتی ہے۔

نور کی شعاعیں جب ہوا میں سے گذرتی ہیں تو جب تک ہوا کی کثافت یکساں رہے گی، وہ خط مستقیم میں چلیں گی لیکن جب کثافت بدل جائے گی تو ان کا راستہ بھی بدل جائے گا۔ اس لئے جب آنکھ اور شئے کے درمیان کی ہوا میں گرم ہوا کی کوئی رَو آجاتی ہے تو شعاع اپنے راستہ سے ہٹ جاتی ہے، اس طرح اگر کئی رَوئیں حائل ہوں تو شئے تھرتھراتی ہوئی نظر آئے گی۔

سائنس دانوں نے نور کی شعاعوں کے ایک کثافت کے مادہ سے دوسری کثافت کے مادہ میں داخل ہوتے وقت مڑ جانے کا نام انعطاف نور رکھا ہے۔ (عطف بمعنی مڑنا) یہ بہت اہم اصول ہے اس سے مدد لیکر بہت سے اعلیٰ درجہ کے مناظری آلات بنائے گئے ہیں جیسے تکبیری شیشہ، خوردبین، دوربین، عکسالہ Camera آلہ سدس Sextant وغیرہ۔

کیا بارش کا پانی پینے کے لئے مضر ہے؟

ہم سب جو پانی پیتے ہیں وہ بارش کا پانی ہے۔ یہ پانی کچھ تو زمین کے اندر جذب ہو جاتا اور چشموں کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، کچھ پہاڑوں پر سے بہہ نکلتا ہے اور کچھ خزانۂ آب میں جمع ہوتا ہے۔ بہرحال سب بارش ہی کا پانی ہے۔

بارش کے پانی کو راست برتن میں بھی جمع کر لیا جا سکتا ہے لیکن اس پانی میں اور زمین پر سے حاصل کئے ہوئے پانی میں فرق یہ ہے کہ ثانی الذکر میں بہت سے نمک شریک ہوتے ہیں اور اول الذکر بڑی حد تک خالص ہوتا ہے۔ اس لئے بارش کا پانی پینے کے لئے تو مضر نہیں البتہ معدنی نمکوں کے مل جانے سے وہ صحت بخش اور مزیدار ہو جاتا ہے۔

زمین پر سے جو پانی حاصل کیا جاتا ہے وہ بعض دفعہ کسی معدن کی وجہ سے معدنی اثرات کا حامل ہوتا ہے ایسے پانی کے چشموں کو معدنی چشمے کہتے ہیں۔ ان کا پانی معدن کی نوعیت کے لحاظ سے مخصوص خصوصیات کا مالک ہوتا ہے۔ بیدر (دکن) میں بھی ایک ایسا چشمہ ہے جس میں گندک ملی ہوئی پائی جاتی ہے اس کا پانی جلدی امراض کو دور کرنے کے لئے بیحد مفید ہے۔

شیر کے جسم پر دھاریاں کیوں ہوتی ہیں؟

قدرت کا یہ بہت دلچسپ راز ہے۔ اس نے جانوروں کی پوشش کو کچھ اس رنگ کا بنایا ہے کہ جس سے ان کی حفاظت ہو جاتی ہے۔ شیر جب جنگل یا جھاڑی میں ہو تو اس کے جسم کا رنگ جنگل کے درختوں اور جھاڑیوں کے رنگ کے ساتھ کچھ اس طرح مل جاتا ہے کہ دشمن اسے پہچان نہیں سکتے۔ اس طرح سے اس کے بچوں کی بھی قدرت حفاظت کرتی ہے۔ مینڈک کا رنگ

خاکستری، درخت پر رہنے والے سانپ کا رنگ سبز بہیر کا رنگ مٹیالا اسی لئے ہوتا ہے کہ دشمن انہیں پہچان نہ سکیں۔

کیا مینڈک پتھروں میں زندہ رہ سکتے ہیں؟

مینڈک اور مینڈک کے بچے اکثر دفعہ کوئلہ اور پتھروں میں مقید پائے جاتے ہیں اور اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ اس وقت سے پتھروں میں موجود ہیں جبکہ ان کی تعمیر عمل میں آئی۔ نیز وہ بغیر غذا کے صدہا برس زندہ رہتے ہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ سائنس داں کبھی یہ باور نہیں کر سکتے کہ مینڈکوں میں اتنی توانائی ہوتی ہے کہ بہت ہی طویل عرصہ تک زندہ رہ سکیں۔ ڈین بک لینڈ نے تجربہ کیا کہ مینڈک بغیر غذا اور ہوا کے ایک سال سے زیادہ عرصہ تک زندہ رہ کر مر جاتے ہیں۔ اور اگر انہیں ہوا بھی دی جائے تو بغیر غذا کے دو سال تک بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔

کوئلہ یا پتھر میں جو مینڈک پائے جاتے ہیں، دراصل وہ مینڈک ہیں جو چھوٹے پن میں پتھروں یا کوئلہ کی درازوں میں گھس جاتے ہیں۔ یہاں انہیں تھوڑی سی ہوا اور کچھ غذا میسر آجاتی ہے جس کے باعث وہ کچھ عرصہ تک زندہ رہتے ہیں۔ انہیں زندگی کے لئے بہت تھوڑی سی ہوا اور غذا کی ضرورت ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ بغیر ہوا اور غذا کے صدہا سال زندہ رہ سکتے ہیں۔

کیا سورج حرکت کرتا ہے؟

بلاشبہ ہر چیز کسی نہ کسی قسم کی حرکت کرتی ہے اور سورج بھی انہیں کے ساتھ اس سے بے نیاز نہیں۔ ایک زمانہ میں لوگ سمجھتے تھے کہ سورج حرکت نہیں کرتا بلکہ بالکل خاموش ہے۔ یہ درست نہیں کیونکہ سورج دو طرح کی حرکت کرتا ہے۔ زمین کی طرح وہ بھی اپنے محور پر زمین ہی کی سمت میں گھومتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ سورج پر جو دھبے نظر آتے ہیں، کچھ دنوں کے لئے وہ آنکھ سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سورج انتقالی حرکت بھی کرتا ہے یعنی ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاتا ہے۔ یہی حال دوسرے ستاروں کا بھی ہے۔ حال ہی میں ایک جرمن ماہر علم ہیئت سائنس دان پروفیسر کاٹین اور دیگر ماہرین نے یہ پتہ چلایا ہے کہ تمام ستارے دو گروہ میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں جو ایک دوسرے کی مخالف سمت میں مختلف چال کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔ ہمارا سورج بھی اپنے خاندان کے ساتھ اس طرح حرکت کر رہا ہے لیکن نہ کوئی ہیئت داں یہ جانتا ہے اور نہ کوئی سائنسداں اس راز سے واقف ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور سب کو کدھر لیجائیگا؟ یاد رہے کہ سورج کی حرکت سے یہ مغالطہ نہ پیدا ہو کہ وہ قدماء کے خیال کے مطابق مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتا ہے!

درخت اوپر کی طرف کیوں اُگتے ہیں؟

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ درخت بالکلیہ اوپر کی طرف نہیں اگتا۔ اس کا کچھ حصہ نیچے بھی ہوتا ہے جسے جڑ کہتے ہیں۔ قدرت کا یہ انتظام ہے کہ ہر چیز برابر اپنی جگہ پر ہوتی ہے۔ بیج میں جس میں درخت اگتا ہے آئین چند خلیے Cells ایسے ہوتے ہیں جو ہوا اور روشنی

میں رہنے کے متقاضی ہیں۔ یہ حصے جدھر روشنی اور ہوا ہوتی ہے اس طرف کا رُخ کرتے ہیں برخلاف اس کے بعض خلیے ایسے ہوتے ہیں جن کی نشوونما تاریکی میں اچھی ہوتی ہے اور دوسرے وہ کچھ جاذبۂ زمین سے بھی متاثر ہوتے ہیں، اسی لیئے اُن کا رُخ زمین کے اندر اس کے مرکز کی طرف ہوتا ہے۔

اگر ہم بیج کو اُلٹ کر بھی بوئیں تو اُس کے مختلف حصے مُڑ کر اپنا اپنا راستہ تلاش کرینگے لیکن جڑ کبھی اُوپر اور تنا کبھی نیچے نہیں بڑھے گا۔ اِس طرح سے معلوم ہوا کہ ہر درخت کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک روشنی اور ہوا میں رہتا ہے اور دوسرا تاریکی میں مٹی کے اندر۔ ہر دو حصے اپنے ماحول سے اپنی نشوونما کے لئے ضروری اجزا حاصل کرتے ہیں چنانچہ پتے ہوا اور روشنی سے استفادہ کرتے ہیں اور جڑیں مٹی سے پانی اور نمکیات۔ اس کے علاوہ جڑیں پودوں اور درختوں کو قائم رکھنے کا بھی کام انجام دیتی ہیں۔

کیا سمندر میں رنگ ہوتا ہے؟

زمین پر رہنے والے جانور اور زمین پر اُگنے والے پودوں کے رنگ توس قزح کے مختلف رنگوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ سمندر میں بھی اسی طرح کے رنگ پائے جاتے ہیں۔ سمندر میں سبز، نیلگوں اور سرخ کنجال کے مرغزار ہیں یہاں ہمیں نیلگوں پردار مچھلی، گلابی رنگ کے دریائی پھول، سرخ مرجان اور چمکدار مچھلیاں ملتی ہیں اور شاید ہی کوئی ایسا رنگ ہو جو زمین پر کی چیزوں میں موجود ہو اور سمندر میں نہ پایا جاتا ہو۔

لیکن سمندر کی گہرائیوں میں جہاں سورج کی شعاعیں پہنچ نہیں سکتیں رنگوں کی زندگی ختم ہوجاتی ہے، ۳۰۰۰ فٹ کی گہرائی پر عکاسی کی تختی متاثر نہیں ہوتی۔ یہاں البتہ بنفشئی اور بالا بنفشئی شعاعیں اپنا اثر کر سکتی ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کا ماہر سائنس ہرمان فال نے نائیس کے قریب غوطہ لگانے کا لباس پہنکر سمندر کے اندرونی حالات کا مشاہدہ کیا اور پتہ چلایا کہ ۳۰ فٹ کی گہرائی پر بھی سرخ اشیا سیاہ نظر آتی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرخ شعاعیں اتنا آگے جا نہیں سکتیں۔ اس امر کا یقین ہے کہ ۱۵، ۱اسو فٹ کی گہرائی پر سوائے بنفشئی کے کوئی رنگ سورج کی روشنی میں نظر نہیں آتا۔ اور اسی گہرائی کے نیچے تمام مچھلیاں بھوری، سیاہ یا بنفشئی سیاہ ہوتی ہیں۔

سمندر کی گہرائی میں جہاں سورج کی شعاعیں اپنا کام نہیں کرتیں مچھلیاں خود اپنی ذاتی روشنی سے استفادہ کرتی ہیں۔ ان میں بعض منور عضویات ہوتے ہیں جو بڑی بڑی قندیلوں کا کام دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص سمندر کی اس گہرائی پر پہنچ جائے تو اسے بزم چراغاں کا لطف آئے گا ان چراغوں کی روشنی میں اسے بنفشئی اور سیاہ مچھلیاں نظر آئینگی۔ قدرت نے ان مچھلیوں اور دیگر سمندری جانوروں میں اس قسم کی روشنی اسی لئے عطا کی ہے کہ ایک تو وہ اپنا راستہ آسانی سے تلاش کر سکیں اور دوسرے اس سے دشمنوں سے محفوظ رہ سکیں۔

کیا مچھلیاں دیکھ اور سُن سکتی ہیں؟

اگر ہم کسی مچھلی گھر میں جا کر دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ مچھلیاں ہم سے زیادہ تیز دیکھتی ہیں۔ ہر ماہی گیر اس حقیقت سے

سے واقف ہے۔ مچھلیاں بُو سے زیادہ اشیاء کے رنگ کو دیکھکر اُن کے قریب آتی ہیں چنانچہ ماہی گیر اس بات کو جانتے ہیں کہ کس مخصوص رنگ کی شئے گل کو لگائی جائے کہ مچھلی جلد اسے پکڑ لے بصارت کی حد تک تو مچھلیوں کی آنکھیں بہت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہیں البتہ سماعت کے معاملہ میں وہ بہت پیچھے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بہری ہوتی ہیں۔

جانوروں کی عمر کتنی ہوتی ہے؟

جس طرح ہم انسان کی اوسط عمر کا اندازہ لگا سکتے ہیں جانوروں سے متعلق صحیح اعداد پیش نہیں کر سکتے کیونکہ اُن کی پیدائش اور موت کا ہمارے پاس کوئی باقاعدہ حساب نہیں رکھا جاتا۔ دوسری چیز یہ کہ اگر ہم چند خاص جانوروں کو گھروں میں رکھکر ان کی عمر کا حساب رکھیں تو بھی یہ اعداد صحیح نہ ہوں گے کیونکہ ہمارے گھروں کی بجائے یہی جانور اگر کھلے میدان یا جنگل میں پرورش پائیں تو یقیناً ان کی عمریں نسبتاً زیادہ ہوں گی۔ بہرحال انسانی تجربہ کی بنا پر جانوروں کی عمروں کا ایک سرسری اندازہ قائم کیا گیا ہے۔

مگرمچھ ۳۰۰ تا ۴۰۰ سال تک زندہ رہتے ہیں، تانبل کو اگر آزادانہ زندگی بسر کرنے کا موقع دیا جائے تو اس کی عمر ۳۰۰ سال کی ہو سکتی ہے۔ ہاتھی کی اگر اچھی طرح پرورش کی جائے تو وہ سو سال تک زندہ رہ سکتا ہے۔ عقاب کی بھی کم و بیش یہی عمر ہوتی ہے لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی عمر ۲۰۰ سال بھی ہوتی ہے وہیل مچھلی کی عمر ۵۰۰ سال ہوتی ہے، بعض وہیل مچھلیوں کے متعلق یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ وہ ایکہزار سال کی عمر رکھتی ہیں۔

ذیل میں چند جانوروں کی عمروں کا اوسط اندازہ درج ہے:-

جانور	عمر	جانور	عمر
خرگوش	۵ سال	گھوڑا	۲۷ سال
بھیڑ	۱۲ 〃	اُونٹ	۴۰ 〃
بلّی	۱۳ 〃	ببر	۴۰ 〃
کتّا	۱۵ 〃	ہاتھی	۱۰۰ 〃
بکرا	۱۵ 〃	تانبل	۳۰۰ 〃
گائے	۲۵ 〃	مگرمچھ	۳۵۰ 〃
سؤر	۲۵ 〃	وہیل	۵۰۰ 〃

پرندے

پرندہ	عمر	پرندہ	عمر
سنہری چڑیا	۱۲ سال	چکور	۳۰ سال
مرغی	۱۴ 〃	چڑیا	۴۰ 〃
چنڈول	۱۸ 〃	بط	۵۰ 〃
کوئل	۱۸ 〃	طوطا	۶۰ 〃
کبوتر	۲۰ 〃	کوّا	۱۰۰ 〃
سارس	۲۴ 〃	راج ہنس	۱۰۰ 〃
مور	۲۴ 〃	شاہین	۱۰۰ 〃

کیا مکھی سن سکتی ہے؟

جانوروں کے احساسات کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ابتداء میں ان میں حس سماعت کی نشوونما نہیں ہوئی البتہ ان کی حس لامسہ اور بصارت میں بہت کچھ ترقی ہوئی۔ اسی باعث اکثر کیڑے بہرے ہیں

جن میں کھیاں بھی شامل ہیں۔ تجربہ کے لئے ممکنہ طور پر زوردار آوازیں استعمال کی گئیں لیکن مکھی اور دوسرے کیڑوں کے کان پر جوں تک نہ چلی۔ ایک انچ کے فاصلہ سے وائیلن کا سب سے اونچے سُر کا تار چھیڑا گیا مگر مکھی اس سے متاثر نہ ہوئی۔ عام مکھیوں پر ہی کیا منحصر ہے شہد کی مکھیاں، چیونٹیاں اور زنبور بھی بالکل بہرے ہوتے ہیں۔

کیچوے کے دو ٹکڑے کرنے کے بعد بھی وہ کس طرح زندہ رہ سکتا ہے؟

سوائے چند ادنیٰ جانوروں کے باقی سب جانوروں کا انحصار نظام عصبی پر ہے۔ اور نظام عصبی ہی کی بدولت حرکت کا ظہور ہے۔ تمام نظام عصبی کا سردار دماغ ہے دماغ پر صدمہ ہوتا ہے تو پورے نظام عصبی کا کام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ لیکن ادنیٰ جانوروں کا حال اس سے بالکل جداگانہ ہے۔ ان کے نظام عصبی کی ترتیب مختلف ہوتی ہے اور وہ تمام جسم میں پھیلا ہوا ہوتا ہے چنانچہ جب کیچوے کو بیچ میں سے کاٹ کر اس کے دو ٹکڑے کر دئیے جاتے ہیں تو اس کے ہر دو حصوں میں اتنا کافی عصبی مادہ ہوتا ہے کہ وہ زندہ رہ سکیں اس طرح سے کیچوے ٹکڑے ہو کر بھی زندہ رہتے ہیں۔

روشنائی سے دھبّہ پڑتا ہے، پانی کا دھبّہ کیوں نہیں پڑتا؟

پانی سے دھبّہ اس لئے نہیں پڑتا کہ اس میں دھبّہ ڈالنے والی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ البتہ اگر وہ رنگین مادہ پر مثلاً اس کتاب کی جلد ہی پر گرے تو اس پر دھبہ اسلئے پڑیگا کہ پانی رنگین مادہ کو وہاں سے نکال دیگا لیکن خود اس کا وہاں کوئی دھبہ نہیں پڑیگا۔ پانی میں کوئی چیز حل شدہ موجود نہیں ہے، اور دھبّہ انہیں مائعات کا پڑتا ہے جنہیں کوئی چیز حل کی ہوئی ہو مثلاً دودھ کو لیجئے۔ اس میں بہت کچھ تیلیا مادہ ہوتا ہے، جب دودھ کسی شئے پر گرتا ہے تو اس پر بہت کچھ تیلیا مادہ رہ جاتا ہے جس پر گرد کے ننھے ننھے ذرات جم کر دھبّہ ڈال دیتے ہیں۔

روشنائی کا حال اُس سے کسیقدر جداگانہ ہے روشنائی پانی ہے جس میں کئی ایک رنگین مادہ حل شدہ ہیں۔ ان حل شدہ مادوں میں زیادہ مقدار لوہے کے مرکبات کی ہے۔ لوہے کے مرکبات بالعموم رنگین ہوتے ہیں۔ جب یہ محلول ہوا میں کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے تو اُس کا پانی آہستہ آہستہ اڑ جاتا ہے، چنانچہ جب کپڑے پر روشنائی گر جاتی ہے تو اس کا دھبّہ لگ جاتا ہے۔

توس قزح کس سمت میں نظر آتی ہے؟

اگر آپ توس قزح کو ذرا غور سے دیکھا کریں تو خود پتہ چل جائیگا کہ وہ ہمیشہ سورج کی مخالف سمت میں نظر آتی ہے۔ اگر شام کے وقت توس قزح آسمان پر نمودار ہو تو وہ مشرق کی سمت میں دکھائی دیگی اور اس کے برخلاف صبح کے وقت مغرب کی طرف۔ اس کی وجہ سمجھنے کے لئے توس قزح کی ماہیئت کا جاننا ضروری ہے۔

جب کسی بلوری شیشے سے سورج کی روشنی گذرتی ہے تو وہ سات رنگوں میں بٹ جاتی ہے، اگر اس روشنی

کو ہم کسی کاغذ پر لیں تو ہمیں سات رنگ کی ایک پٹی نظر آئے گی جس میں بنفشی، نیلگوں، آسمانی، سبز، زرد، نارنجی اور سرخ رنگ اسی ترتیب سے نظر آئینگے۔ اس سات رنگ کی پٹی کو سائنس کی زبان میں **طیف** کہتے ہیں۔ بلور کے علاوہ اگر سورج کی شعاعیں پانی کے ننھے ننھے قطرات سے گذریں تو بھی ہمیں یہی سات رنگ نظر آئینگے چنانچہ منہ میں پانی لیکر دھوپ کے وقت پھونک ماریں تو ہر شخص خود اس دلچسپ منظر کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پانی کے قطرات بھی سورج کی شعاعوں کے ساتھ وہی برتاؤ کرتے ہیں جو شیشہ کا ایک شلثی ٹکڑا، جسے ہم بلور کہتے ہیں کرتا ہے۔ اب جب کہ فضاء بخارات آبی سے معمور ہوتی ہے، اور سورج کی شعاعیں ان قطرات آب پر پڑتی ہیں ہمیں آسمان پر سات رنگ کی ایک کمان سی نظر آتی ہے جسے ہم **قوس قزح** کہتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس سمت میں سورج ہوگا اس سمت میں تو قوس قزح نظر نہ آئیگی بلکہ ہمیشہ اسکی مخالف سمت میں دکھائی دیگی۔

کیا مرغی یہ جانتی ہے کہ اس کے انڈوں میں سے بچے نکلینگے؟

ہم میں اور جانوروں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ جانوروں کا دارومدار جبلت پر ہے اور انسان میں جبلت ترقی کر کے ذہانت کے رتبہ کو پہنچ چکی ہے۔ جانور بہت سے کام بلا مقصد کرتے اور انہیں معلوم نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ جانور اپنے افعال کی پیش بینی نہیں کر سکتے کیونکہ ان میں استدلال نہیں ہوتا۔ وہ صرف جبلت پر بھروسہ کرتے ہیں اور جبلت ہی ان کے ہر کام میں رہبر ہوتی ہے مچھلی کا بچہ بغیر سکھائے تیرنے لگتا ہے، انسان کا بچہ ماں کی چھاتی سے دودھ پیتا ہے لیکن یہ جان کر نہیں کہ دودھ اسے زندگی بخشے گا اور اس سے اس کے اعضاء کی نشوونما ہوگی۔ یہ محض جبلت ہے۔ جبلت ایک فطری چیز ہے جو انجان طور پر کسی کام کے لئے مجبور کرتی ہے۔

بعض بلند رتبہ کے جانور مثلاً گھوڑا، کتا وغیرہ کسی جبلی فعل کے مخصوص نتائج کو مسلسل کئی تجربوں کے بعد تھوڑا بہت جاننے لگتے ہیں کہ کیا ہوگا لیکن اگر مرغی ایک نہیں، ۲۰ مرتبہ بھی انڈوں پر بیٹھے تو یہ نہیں جان سکتی کہ اس کے اس طرح بیٹھنے سے بچے نکلینگے، البتہ وہ انڈوں پر بیٹھ کر لطف اٹھاتی ہے اور جب انڈوں سے بچے نکلتے ہیں تو ان کو دیکھکر خوش ہوتی اور ان کے ساتھ ساتھ رہتی ہے، یہ ایک فطری چیز ہے۔

جہازوں میں خطِ آب کیوں ہوتا ہے؟

جب جہاز پانی پر تیرتا ہے تو پانی کی سطح جہاز کو جس خط سے قطع کرتی ہے اسے جہاز کا خطِ آب (Water-line) کہتے ہیں۔ اس خط کا تعلق جہاز اور اس کے اندر کے سامان کے وزن سے ہے، جتنا زیادہ سامان ہوگا، خط بھی اتنا ہی اوپر ہوگا۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ جہازوں میں بے تکے پن سے سامان بھر لیتے تھے جس کے باعث وہ غرق ہو جاتے تھے اور ہر وقت مسافرین کی جان کا خطرہ رہتا تھا۔

۱۸۶۸ء میں ایک انگریز سیموئیل پلمزول نے اس بے قاعدگی کو محسوس کیا اور مالکان جہاز کے خلاف ایک زوردار کارروائی کر کے ایک قانون نافذ کرایا کہ جہازوں

کی حیثیت کے مطابق ان میں ایک خاص وزن کا سامان بھرا جائے۔ اس کے اندازہ کے لئے جہازوں پر ایک خط کھینچ دیا جائے اور سامان اتنا نہ بھرا جائے کہ پانی کی سطح خط سے اوپر ہو جائے۔ اس طرح سے جہازوں پر ایک قانونی روک ہو گئی۔ اس خط کو خط پلمز ول Plimsoll line کہتے ہیں۔ اس قانون کے نفاذ سے بہت کچھ جانی اور مالی فائدہ ہوا۔

گرج سے دودھ کیوں پھٹ جاتا ہے؟

گرج دراصل ہوا میں ایک طرح کا خلل ہے جو برق کے ہوا میں گذرنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جسے ہم بجلی کہتے ہیں۔ گرج کی آواز سے دودھ نہیں پھٹتا بلکہ اس کی کچھ اور وجہ ہے۔ جب گرج پیدا ہوتی ہے تو ہوا برق سے برقائی جاتی ہے، اس کے علاوہ وہ مرطوب اور گرم ہو جاتی ہے۔ ان تینوں باتوں کی وجہ سے بالخصوص برق اور گرمی کی وجہ سے دودھ پھٹ جاتا ہے۔

بال کترنے سے ہمیں درد کیوں محسوس نہیں ہوتا؟

ہمارے جسم کے کسی حصے کو ذرا صدمہ پہنچتا ہے تو تکلیف محسوس ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جسم کے ہر حصہ پر بے شمار چھوٹے چھوٹے اعصاب پھیلے ہوئے ہیں جو درد کے احساس کو دماغ تک پہنچاتے ہیں۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر اعصاب نہ ہوں تو درد ہی محسوس نہ ہوگا۔ چنانچہ جب کسی مقام پر درد زیادہ ہوتا ہے تو ڈاکٹر اس حصہ کو بعض خاص ادویات لگا کر سُن کر دیتے ہیں۔ لیکن بال کو کترنے سے ہمیں کچھ بھی تکلیف نہیں ہوتی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ بالوں میں اعصاب نہیں ہوتے اسی وجہ سے ان کو کترنے سے تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔

جمائی کس لئے متعدی ہے؟

یہ بڑا دلچسپ سوال ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ جمائی ایک متعدی چیز ہے مجلس میں ایک نے جمائی لی اور جمائیوں کا سلسلہ بندھ گیا۔ لیکن بہت کم لوگ اس کی حقیقت سے واقف ہیں۔

انسان کی زندگی کے لئے سب سے ضروری چیز سانس ہے۔ جمائی ایک گہری سانس ہے۔ انسان جمائی اس صورت میں لیتا ہے جبکہ وہ یا تو تھکا ہوا ہو یا کچھ بیمار ہو۔ ان حالات کے تحت انسان کو زیادہ ہوا جسم کے اندر داخل کرنی ہوتی ہے تاکہ اس کا نظام بیماری یا تھکاوٹ سے پیدا ہونے والی رکاوٹ کی تلافی کر سکے۔ اس لئے وہ فطری طور پر زوردار سانس لیتا ہے جسے جمائی کہتے ہیں۔

اب یہ بالکل کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان پر اثر آفریں ہوتا اور اس سے متاثر کرتا ہے۔ آپ کسی کو کھانا کھاتے دیکھتے ہیں تو خود بھی کچھ کھانے کو جی چاہتا ہے۔ ایک شخص دوسرے کو خوف زدہ دیکھکر خود بھی سہم جاتا ہے۔ اگر کسی مجلس میں سب لوگ ہنستے رہیں تو ہمارا جی بھی ہنسنا چاہتا ہے اگر سب آزردہ ہوں تو ہم پر بھی اُداسی چھا جاتی ہے۔ اسی طرح سے اگر مجلس میں ایک شخص بھی صورت بُری بنا کر بیٹھے تو مجلس کا رنگ خراب ہو جاتا ہے، مثل مشہور ہے

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

کیوں؟ اسی لئے کہ اس کا فعل دوسروں پر اثر آفرینی کرتا ہے اور جو فعل ہماری زندگی کی ضروریات سے زیادہ قریبی ہوتا ہے اس کا اثر تیز ہوتا ہے۔ جمائی کا بھی ہماری زندگی کی ضروریات سے بہت قریبی تعلق ہے، اسی باعث اُس میں اثر آفرینی زیادہ ہے اور اگر ایک شخص جمائی لے تو دوسرے بھی جمائی لینے لگتے ہیں۔ یعنی یہ متعدی ہے۔

سمندر کے تنگوں کو دیکھکر ہم کس طرح موسم کے تبدیل ہونے کا پتہ لگا سکتے ہیں؟

تنگے دراصل موسم کی تبدیلی کے متعلق ہماری رہبری کرتے ہیں۔ بار پیما کی طرح تنگے بھی موسم کی حالت کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ ایک اشارہ دیتے ہیں۔ بار پیما سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص وقت پر ہوا کتنی بھاری ہے۔ اس واقعہ سے ہم کم وبیش صحت کے ساتھ یہ بتلا سکتے ہیں کہ موسم کی حالت کیا ہوگی۔ اس کے سوا بار پیما سے ہمیں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ تنگوں سے ہمیں ہوا کے بھاری پن یا دباؤ کا پتہ نہیں چلتا بلکہ صرف ہوا کی رطوبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ گویا اسی طرح سے ہمیں ہوا کی گرمی کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔

اگر تنکا بہت مرطوب ہو تو اُس سے صاف ظاہر ہے کہ ہوا میں رطوبت زیادہ ہے۔ اگر خشک ہو تو ہوا میں خشکی ہوگی۔ اس طرح سے بارش امکانات اور اس کی کمی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مچھلیاں کیوں نہیں ڈوبتیں؟

تمام حیوانات اور نباتات کی زندگی کے لئے ہوا ضروری ہے۔ یا بالفاظ دیگر انہیں آکسیجن کی ضرورت ہے جو ہوا کا ایک خاص جزو ہے۔ اگر یہ نہ ملے تو موت قطعی ہے۔ جب آدمی ڈوبتا ہے تو اُسے آکسیجن نہیں ملتی اُس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہوا میں آکسیجن ملی ہوئی نہیں ہے بلکہ اُس میں جو آکسیجن ہے وہ انسان لے نہیں سکتا اس لئے کہ صرف ہوا میں اُن کا تنفس جاری رہ سکتا ہے۔ مچھلیاں پھیپڑوں سے نہیں بلکہ گل پھڑوں سے سانس لیتی ہیں اور گل پھڑوں کی ساخت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ وہ پانی سے آکسیجن لے سکتے ہیں۔ اگر آکسیجن نکال لی جائے تو مچھلیاں ڈوب جائینگی۔

ہم بعض باتیں بھولتے اور بعض یاد رکھتے ہیں کیوں؟

حافظہ کا تعلق اُن ارتسامات سے ہے جو مختلف واقعات سے مرتسم ہوتے ہیں۔ جن واقعات سے زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی یا جنہیں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں، اُن کے نقوش دیرپا نہیں ہوتے برخلاف اسکے جو واقعات ہماری زندگی سے قریب تر اور ہمارے جاذب نظر ہوتے ہیں، خواہ وہ کس قدر ہی معمولی یا حقیر کیوں نہ ہوں حافظہ میں مدت العمر اس طرح محفوظ رہتے ہیں گویا کل کی بات ہے۔

ایشیا

جغرافیہ

ایشیاء دنیا کا سب سے بڑا براعظم ہے جو اپنی وسعت میں یورپ سے چار گنا بڑا ہے اور امریکہ کے دونوں حصے بھی متحدہ طور پر اس سے رقبے میں کم ہیں یہ براعظم شمال میں بحرِ منجمد شمالی سے شروع ہو کر تمام منطقات شمالی پر پھیلتا ہوا خطِ استوا کے بالکل قریب تک آگیا ہے۔ اور اگرچہ کہ اس کا یہ طول پانچ ہزار میل کے قریب ہے لیکن شرقاً غرباً یعنی کوہستان یورال سے بحرالکاہل تک اس کا عرض اور بھی زیادہ یعنی چھ ہزار میل کے قریب ہے۔

حدود اس کی شمال مشرقی اور جنوبی سرحدیں بحرِ منجمد شمالی بحرالکاہل اور بحرِ ہند سے ملی ہوئی ہیں۔ مغرب میں ایشیاء اور یورپ کے دامن ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں پھر بھی کوہ یورال اور کوہ قاف کے پہاڑی سلسلے ان کے حدود شمار کئے جا سکتے ہیں اور بحیرۂ اسود اور بحیرۂ روم انہیں ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں۔ اسی طرح بحیرۂ قلزم اس کے اور افریقہ کے درمیان حائل ہے۔

جغرافیائی تقسیم جتنا بڑا یہ براعظم ہے اتنی ہی مختلف کیفیات کا یہ حامل بھی ہے۔ کوئی خطہ اونچا ہے تو اتنا اونچا کہ دنیا کے بلند ترین مقامات میں شمار ہوتا ہے۔ وسط میں ہمالیہ کی فلک بوس پہاڑیاں کنگرۂ عرش سے جا ملتی ہیں۔ اس کی چوٹی ایورسٹ ۲۹ ہزار فیٹ بلند ہے اور یہی دنیا کی بلند ترین چوٹی ہے تھیان شان کا سلسلہ شمال مشرق میں تقریباً ۵۰۰ میل تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی بلندی ۲۵ ہزار فیٹ ہے یہ ترکستان اور سائبیریا کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔

کیون لن کی پہاڑیوں کی اونچائی ۲۰ ہزار فیٹ

کے لگ بھگ ہے۔ یہ کچھ اس طرح پھیلی ہوئی ہیں کہ سطح مرتفع تبت کا شمالی گوشہ ننگی ہیں۔ انہی کے دو سلسلے مغربی چین اور منچوریا میں ایک طرف اور دوسری طرف سائبیریا کے شمال مشرقی حصے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

کوہستان قراقرم جو تخمیناً ۲۶ ہزار فیٹ بلند ہے تبت میں واقع ہے۔

کوہ ہندوکش افغانستان کے علاقوں پر پھیلا ہوا ہے اور یہ ہندوستان کی شمال مغربی حد حاصل ہے۔

ان پہاڑوں کے علاوہ بہت سے خطے اپنی غیر معمولی بلندیوں کی وجہ سے ایشیاء کے وسیع برآعظم میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ تبت کا علاقہ سب سے زیادہ شہرت رکھتا ہے۔ یوں تو شمالی ایران اور آرمینیا اور کردستان اور دکن کے مرتفع حصے بھی ۶ ہزار سے ۱۰ ہزار فیٹ تک بلند ہیں۔

وسط ایشیاء کی سطح مرتفع سے تین بڑے دریا "سائبیریا" سے گذرتے ہوئے بحر منجمد شمالی میں آگرتے ہیں دریائے "اوبی" جس کی لمبائی ۳۲۰۰ میل ہے اور جس کا معاون "آرتش" بہت نمایاں ہے۔

"یے نیستی" ۲۹۰۰ میل اور دریائے "لینا" ۲۸۰۰ میل تک بہتا ہے۔ کچھ تو اپنی لمبائی کی وجہ سے اور کچھ زمین کی تدریجی نشیب کے باعث ان دریاؤں کی رفتار سست ہے۔ دریائے "ہوانگ ہو" تبت سے نکلکر ۲۵۰۰ میل تک بہتا ہوا بحیرۂ زرد میں جا گرتا ہے اس کا بہاؤ بہت تیز ہے۔ چین کے مغربی کوہستانی علاقے میں "ینگ سی کیانگ" بہتا ہے۔ اس کی لمبائی ۳۲۰۰ میل کے قریب ہے اور یہ بحیرۂ چین میں جا ملتا ہے۔ ہمالیہ سے دو بڑے دریا سندھ اور گنگا نکلکر ہندوستان کے ایک بڑے حصے کو سیراب کرتے ہوئے بحیرۂ عرب اور خلیج بنگال میں جا گرتے ہیں۔

موسم ظاہر ہے کہ اتنے بڑے برآعظم میں موسم میں اختلاف پایا جانا تعجب خیز نہیں ہے۔ اس کا ایک حصہ سرد ہے تو اتنا سرد کہ ضرب المثل ہو گیا۔ دوسرا حصہ گرم ہے تو انتہا تک پہونچ گیا۔ "سائبیریا" کی سردی زبان زد خاص وعام ہے۔ یہاں ایک قصبہ "ورخویانسک" نامی ہے جس کے درجہ حرارت کا اوسط صفر سے بھی ساٹھ درجہ نیچے ہے۔ عرب اور بعض دوسرے ریگستانوں کی حرارت ایشیاء کی گرمی کی انتہا خیال کی جاتی ہے۔

مجموعی طور پر ساحلوں کے سوا ایشیاء کے موسم شدید ہوتے ہیں۔ شمالی میدان نہایت خشک ہیں۔ مغربی گرم و خشک۔ وسطی سطح مرتفع ہونیکی وجہ سے سرد اور مرطوب اور جنوبی علاقے کہیں گرم اور کہیں مرطوب۔

اس بڑے برآعظم کو موسم کے اعتبار سے پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) بحر منجمد شمالی کا سرد و خشک خطہ۔

(۲) "سائبیریا" کا بری خطہ جس کے چند روز موسم گرما میں تو ایک دو انچ بارش ہو جاتی ہے مگر باقی تمام سال مینہ کا ایک قطرہ نہیں برستا۔

(۳) وسط ایشیاء کا خشک و بے گیاہ خطہ جس میں صحرائے گوبی اور عرب شامل ہیں۔

(۴) باد برشگال کا خطہ یعنی ہندوستان چین اور ہند چینی۔

(۵) خط استوا کا خطہ جو ہمیشہ گرم رہتا ہے۔

ساحل ایشیا کے ساحل کا بڑا حصہ جہاز رانی کے لئے موزوں نہیں ہے۔ اس کا شمالی حصہ یخ بستہ ہونیکی وجہ سے غیر آباد ہے مشرقی ساحل میں متعدد دریا خلیج اور آبنائے واقع ہیں۔ یہ حصہ جزیرہ نمائے ملایا کے آخری سرے "راس رومانیا" سے شروع ہو کر جنوبی بحیرۂ چین تک چلا گیا ہے۔ جنوبی ساحل پر تین جزیرہ نما عربستان ہندوستان اور ہند چینی واقع ہیں۔ جزیرہ نمائے عرب اور ہند کے درمیان بحیرۂ عرب ہے جس کی دو شاخیں بحیرۂ قلزم اور خلیج فارس میں شمال کی طرف چلی گئی ہیں۔ اسیطرح ہند چینی اور ہندوستان کے درمیان خلیج بنگال واقع ہے۔ ایشیا کا مغربی ساحل بحیرۂ روم اور بحیرۂ قلزم سے گھرا ہوا ہے۔

بارش سب سے زیادہ بارش ہندوستان کے اس حصے میں ہوتی ہے جو ہمالیہ کی وادیوں میں واقع ہے "کھاسی" کلکتہ کے شمال مشرقی حصے میں ایک مقام ہے جہاں ۶۰۰ انچ سالانہ بارش ہوتی ہے اور یہی غالباً دنیا کا رکارڈ ہے۔

شمالی ایشیا میں بارش کا اوسط منچوریا شمالی چین کوریا سیام اور جاپان میں ۱۹ اور ۴۹ کے درمیان ہے۔ جنوب مغربی سائبیریا میں ۱۲ اور ۱۴ کے درمیان بارش کا اوسط ہے۔ مگر مشرق کی طرف جوں جوں بڑھتے جایئے اس کی مقدار کم سے کم ہوتی جائیگی حتی کے ۵ یا ۶ پر رک جاتی ہے چین میں ۲۳ انچ اوسط ہے اور جاوا میں ۸۰ انچ مگر سنگاپور میں ۱۰۰ انچ کے لگ بھگ بارش ہوتی ہے برما کے ساحل پر ۲۰۰ انچ بھی بارش ہوجاتی ہے ہندوستان کے مغربی ساحل پر ۷۵ اور ۱۰۰ کے درمیان بارش کا اوسط سمجھا گیا۔ لیکن مشرقی حصے میں ۵۰ انچ انتہا ہے۔ لنکا میں ۶۰ اور ۸۰ انچ کے درمیان بارش ہوجاتی ہے۔

نسل انسانی ایشیا اپنی وسعت کی وجہ سے دنیا کی بہت سی اقوام اور مختلف نسلوں کا گھر کہلایا جاسکتا ہے۔ مگر اس کا بڑا حصہ منگولی نسل سے آباد نظر آتا ہے یہ اپنے زرد نما بھوری کھال۔ سیاہ اور چھوٹی آنکھیں اور چپٹی ناک کی وجہ سے شناخت کئے جاتے ہیں۔ ان کے قد چھوٹے ہوتے ہیں یہ شمالی ایشیا تبت چین اور جزیرہ نمائے ملایا میں عموماً آباد ہیں۔

ان کے بعد جو نسل ایشیا میں زیادہ نظر آتی ہے اسکو پروفیسر ہکسلے Xanlhochroio, Melanochroie کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ اول الذکر وہی سیاہ بالوں والی نسل ہے جو جنوبی یورپ اور شمالی افریقہ میں نظر آتی ہے۔ اور ایشیا میں بھی شام و جنوب۔ مغربی ایشیا۔ عرب۔ ایران۔ ہندوستان اور ایشیائے کوچک کے بعض مقامات پر آباد ہے۔ آخر الذکر نسل بھورے بالوں والی شمالی یورپ کی نسل سے ملتی جلتی ہے۔

تیسری قسم کی نسل Australoid ہے ان کے بال سیاہ اور عموماً ملائم ہوتے ہیں آنکھیں بھی سیاہ ہوتی ہیں۔ ناک چوڑی اور اونچی ہونٹ موٹے اور جبڑے بھدے نظر آتے ہیں۔ یہ نسل دراصل خالص ہندوستانی سمجھی جاتی ہے جس کو دراوڑی بھی کہا جاتا ہے اور اُن کا Melanochroic سے میل ایک نئی نسل پیدا کرتا ہے جو عام طور پر یہاں دکھائی دیتی ہے۔

حبشی نسل بھی افریقہ سے یہاں پہونچی اور بعض خطوں میں اس کے افراد اپنے اصلی خد و خال میں موجود

ہیں اور بعض جگہ دوسری نسلوں سے مل جل کر انہوں نے ایک تیسری ہی قسم کی نسل پیدا کرلی۔

ہندوستان کی آریائی نسل ایشیا کی سب سے متمدن نسل سمجھی جاتی ہے۔

تاریخ

اگر قوموں کی ترقی اور زوال کے کارناموں کو تاریخ کہا جا سکتا ہے تو ہمیں ایشیا کی مختلف اقوام کی زندگیوں پر ایک نظر ڈالنی ضروری ہے۔

اگر ہم اُن اختلافات کو جو قوموں کی ابتدائی تاریخ میں رونما ہوتے ہیں نظر انداز کر دیں تو ہم دیکھیں گے کہ ایشیا کے جنوبی حصے قدیم ترین اقوام عالم کی رہائش گاہ رہ چکے ہیں۔ بابل، چین، ایران اور ہندوستان قدیم ترین تمدنوں کے گہوارے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ چینی مغرب سے آئے۔ لیکن صحیح طور پر مقام کا پتہ نہیں چلتا۔ ہندوستانی اقوام اور ایرانی قومیں شمال مغرب سے آئیں۔ برمی اور سیامی شمال سے۔ ترکوں اور مغلوں کے متعلق یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ وسط ایشیا ہی کے اصلی باشندے ہیں یا وہ بھی کہیں سے آئے۔ اقوام کی ان گذرگاہوں پر نظر رکھنا اسلئے بھی ضروری ہے کہ اُن کی تہذیب اور اُنکے تمدن کا پتہ اس کے بغیر نہیں مل سکتا۔

ایشیا کی تاریخ جو اب تک واقعات پر مبنی ہو سکی وہ دو ہزار سال اُدھر کی ہے اور اس میں چار عناصر کا اثر نظر آتا ہے۔ چینی، ہندوستانی، اسلامی اور وسط ایشیا کے تمدن وقتاً فوقتاً ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے اور اُنہی کے اثرات کی تدوین کا نام ایشیا کی تاریخ رکھا گیا۔

بابل بابل کا تمدن ایشیا کے قدیم ترین تمدنوں میں شمار ہوتا ہے لیکن اس کی ابتدا کو سنہ اور سال میں پیش کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ البتہ یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ بابل کی قدیم سلطنتیں ساتویں صدی قبل مسیح تک عروج پر رہیں پھر اُن میں زوال کے آثار نمایاں ہوئے اور انہی کھنڈروں پر ایران کی مملکت کی عمارت کھڑی ہوئی جو اسلام قبول کرنے کے بعد ایشیا کے اکثر مقامات پر سیلاب کی طرح پھیل گئی۔

جنوب مغربی ایشیا کی تاریخ میں سامی تمدن کو بڑا دخل ہے۔ دنیا کے دو بڑے مذاہب عیسائیت اور اسلام سامی ماحول میں پیدا ہوئے اور یہودیت کی نشو و نما بھی یہیں ہوئی۔ سیاسی نقطہ نظر سے ان اقوام کے عروج کا ذکر نہیں۔ لیکن تہذیب اور تمدن کے سرچشموں کی حیثیت سے ان کا نام نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اسی سلسلے میں عام طور پر یہ باور کیا جاتا ہے کہ یہ تمدن ابتدائی شکل کے لئے Sumero - akkadians قوم کا ممنون رہا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا تعلق ترکوں اور "ہن" کے اسلاف سے ہو جن کے اثرات آج بھی اکثر مقامات پر دکھائی دیتے ہیں۔ ایشیائے کوچک کی غیر آریائی اقوام مثلاً Alorodians Hittites کے بارے میں تاریخ ساکت ہے۔ ایک مکتب خیال اس کا بھی حامی ہے کہ بحیرہ روم کے کنارہ ایک زمانہ میں وہ قوم آباد تھی جو نہ تو آریائی نسل سے تھی نہ تو سامی۔

سامی نسل کی قدیم تاریخ چار ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد بابل اُنہی کے قبضہ میں نظر آتا ہے۔ شہر بابل ۲۲۸۵ سال قبل مسیح

مشہور دارالخلافہ تھا۔ اسیریا حکومت بابل کی ایک شاخ شمال مغرب میں تھی یہاں وہی زبان مروج تھی جو کہ بابل میں بولی جاتی تھی۔ لیکن اس نے اپنی انفرادیت کو جس طریقہ میں باقی رکھا وہ اس کے آرٹ اور مذہب میں جھلکتا ہے۔ نویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح میں اسے عروج ہوا اتنا کہ بابل کے خدوخال پر بھی اسی کا غازہ چمکنے لگا۔ لیکن ۶۰۶ ق۔م میں زوال کے آثار نمایاں ہوئے اور چونکہ اس کی ترقی کا دارومدار فوجی طاقت پر تھا اس لئے شکست کے بعد اس کا نام بھی مٹنے لگا۔ برخلاف اس کے بابل تمدن کا چونکہ گہوارہ تھا اس لئے فتحیاب قوموں نے بھی اس کے تمدن کو اختیار کیا۔

چین چین ہی وہ قدیم ترین ریاست ہے جو آج بھی باقی ہے۔ اس کی تاریخ ۱۰۰۰ ق۔م تک پہونچتی ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ بابل اور چین کے تمدنوں میں کوئی تعلق تھا۔ لیکن تعلقات کی تشریح اور تفصیل نامعلوم ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ چینی مغرب سے آئے اور "ہوانگ ہو" کے کنارہ ۳۰۰۰ ق۔م میں آباد ہوئے۔ تاریخ چین کے ابتدائی اوراق جاگیرداری نظام کی قسم کی سلطنتوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان میں وقتاً فوقتاً تغیر و تبدل ہوتا رہا تا آنکہ ۲۲۰ ق۔م میں Chin یا Tsin نامی سلطنت نمایاں نظر آتی ہے اور غالباً یہی موجودہ مملکت چین کی ابتدا ہے۔ اس کے بعد بشمار خونریز لڑائیاں اور قوموں کی خانہ جنگیاں نظر آتی ہیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انہی اقوام میں تاتاری بھی شامل تھے اور حالانکہ متعدد مرتبہ مملکت چین کے حصے بخرے ہوگئے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہی دوران میں دو دفعہ چین ایشیا کی عظیم ترین مملکت کہلائی اور یہ زمانہ خاندان ہان (تقریباً ۲۰۰ ق۔م تا ۲۲۰ء) اور ٹانگ (۶۱۸ - ۹۰۶ء) کا ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی میں منگولی طاقت کو زور ہوا اور قبلے خاں Kublai-khan نے چین فتح کرلیا تقریباً ایک صدی تک منگولی خاندان برسر اقتدار رہا۔ اور اس کے بعد پھر ایک مقامی خاندان نے جسے مینگ کہا جاتا ہے چین کی عنانیں اپنے ہاتھوں میں لے لیں اس کا عروج ۳۰۰ سال تک رہا اور اسی نے ہندوستان لنکا اور مشرقی افریقہ کی فتوحات کے خواب دیکھے۔ اور فوجیں بھی روانہ کیں جن کا پتہ آج تک نہ چل سکا۔

ایران ایرانی تہذیب کا سراغ زرتشت کے زمانہ سے ملتا ہے۔ یہ غالباً ساتویں صدی ق۔م کا زمانہ تھا اور گو کہ یہ مذہبی تمدن تھا لیکن عام طور پر خطۂ ایران پر ہر جگہ چھایا ہوا تھا۔ اسی زمانہ میں ایران نے اپنے کندھے سے اسیریا کا جوا اتار پھینکا۔ چھٹی صدی کے بعد سے اس کی حکومت جو اس وقت مملکت Median کہی جاتی تھی کا تسلط پورا پورا ہوگیا۔ اس نے اہل بابل کی مدد سے "نینوا" کو تاراج کیا۔ اور نصف صدی بعد ہی Cyrus نے بابل پر قبضہ کرلیا اور مشہور خاندان Achæmenidae کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس خاندان کا جب انتہائی عروج ہوا تو اس کا پرچم دریائے سندھ سے دریا آکسس تک مشرق میں تھریس تک مغرب میں اور مصر تک جنوب میں لہرانے لگا۔ لیکن تقریباً دو سو سال کے اندر ہی اندر اسے یونانی قوت کے آگے سر تسلیم خم کرنا

پڑا سکندر اعظم کی فتح کے بعد غالباً ۲۶۰ ق م سے یونانی تہذیب کا جھنڈا بلند ہو گیا لیکن بعض مقامات میں تورانی تہذیب کے نام سے ایک نیا تمدن خاموشی سے پرورش پانے لگا۔ حتیٰ کہ اسلام کا چڑھتا ہوا دریا اس تک پہونچ گیا۔ اور بہت جلد مذہب اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا تمدن ایک خاص شکل اختیار کرتا گیا۔ اور یہی مختلف صورتیں بدل بدل کر پہلوی، صفوی اور ترکمانی تمدنوں کے نام سے برابر عروج اور زوال پاتا رہا۔

ہندوستان

ہندوستانی تمدن کے اگر تین حصے کئے جائیں تو پہلا دوران غیر متمدن اقوام کا نظر آتا ہے جنھیں کول سنتال وغیرہ کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور دوسرا دراوڑی جن کے متعلق مشہور ہے کہ یہی ہندوستان کے اصلی باشندے ہیں۔ اور تیسرا دور آریاؤں کی آمد سے شروع ہوتا ہے۔ آریا شمال مغربی دروں سے ہندوستان آئے اور اُن کا اصلی گھر وسط ایشیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ اپنے ساتھ وسط ایشیا کا تمدن لائے ہونگے۔ قدیم آریاؤں کے تمدن کی ایک جھلک مہابھارت اور رگ وید میں نظر آتی ہے اور یہ شاید چھٹی صدی قبل مسیح کا زمانہ ہے ان شہرۂ آفاق نظموں میں اس قوم کی طرز معاشرت طریقہ حکومت اور ذریعہ کسب معاش جس طرح ملتے ہیں اِن پر اگر بھروسہ کر کے کہا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجموعی طور پر ان میں جمہوریت کا وہ اوّلین اور دھندلا سا خاکہ تھا جس کو دنیا نے آج کچھ بڑھا چڑھا کر چار دانگ عالم میں پھیلا دیا۔

برہمن مذہب کی ترقی میں بدھ مت حائل ہوا اور بہت جلد گوتم بدھ کی انسانی نبض شناسی نے اسکی ترقی میں پر لگا دئے۔ رفتہ رفتہ مذہب تمدن کی جگہ لینے لگا۔

۳۲۶ ق۔م میں سکندر کا حملہ پنجاب پر ایک ایسی یادگار ہے جس نے تاریخ اور تمدن دونوں پر یکساں اثر کیا۔ سیاست سے قطع نظر یونانی تہذیب کا پرچار شروع ہوا اس کو دیکھ کر یہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ ہندی تمدن دوسری کروٹ لینے والا ہے۔ مگر سکندر کی شخصیت ہندوستانی فضا میں پرچھائیں سے زیادہ وقعت پیدا نہ کر سکی۔ اور اس کے اثرات بھی سکندر ہی کی جلو میں واپس ہو گئے۔

۵۰ اق۔م اور ۳۰۰ء کے درمیان "پارتھین" اور یوچی (Yuechi) اقوام نے کشمیر میں اپنے قدم جمانے شروع کئے۔ اِسی سلسلے میں خاندان "کشان" کا زور ہوا اور انہوں نے بدھ مت کو بانس پر چڑھا دیا لیکن یہ جس تیزی کے ساتھ ابھرے تھے اُسی سرعت کے ساتھ مٹنے لگے۔ اُن کی جگہ پھر ہندو مت نے لے لی۔

سندھ پر عربوں کا حملہ ہندوستانی تمدن کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ مگر عربوں نے جو داغ بیل اِس ریتیلے حصے میں ڈالی تھی وہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہ آئی۔ لیکن چونکہ اسلام ہندوستان کے شمال مغربی حصے کے اردگرد قدم جما چکا تھا اس لئے یہ ناممکن ہوا کہ وہ اپنا اثر ہندوستان پر بھی نہ جمائے۔ محمود غزنوی اور محمد غوری کے حملے اور ان کی فتوحات ایسی نہ تھیں جو ہندوستانی تہذیب کی کایا پلٹ نہ دیتیں۔ اِسلامی سلطنتوں کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور آہستہ آہستہ مسلمانوں نے اپنے پاؤں پھیلانے شروع کئے۔ مگر ۱۵۲۶ء ہندوستان کی اِسلامی تاریخ میں بہت نمایاں اس وجہ سے ہے کہ بابر نے

پانی پت کے میدان میں مغلیہ حکومت کا سنگ بنیاد رکھا اور اکبر اعظم کا وہ زمانہ تمدن کے نقطہ نظر سے سب سے زیادہ اہم اس وجہ سے شمار کیا جاتا ہے کہ ہندوستانی اور مغلوں کی تہذیب آپس میں گھل مل کر ایک ملے جلے تمدن کو ظہور میں لانے کا باعث ہوا۔

یہیں ہندوستان کی تمدنی تاریخ ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کا وہ حصہ بھی کافی اہم ہے جو انگریزوں کے یہاں قدم رکھنے کے بعد نمایاں ہوا۔ کسے خیال گذر سکتا تھا کہ انگریز سات سمندر پار سے ہندوستان میں پہونچ کر اپنی حکومت کا جھنڈا اس کی بسیط فضا میں لہرائینگے۔ ظاہر ہے کہ فاتح قوم نے اپنے تمدن کو پھیلانیکی جو سرگرمی شروع کی وہ دن دونی رات چوگنی رفتار سے بڑھتی گئی اور ۱۸۵۷ء کے غدر پر اُن کا قابو پالینا ایسی کھُلی ہوئی کامیابی کی دلیل ہے کہ جو شکل سے تاریخ عہد برطانیہ دوبارہ پیش کرسکیگی۔

یہودی

یہودی ہمیشہ سے بے گھر رہے ہیں۔ اُن کا وجود ایک مذہبی فرقے کی حیثیت سے دنیا میں باقی ہے۔ لیکن سیاسی نقطہ نظر سے نہ انہوں نے کبھی حکومت کی اور نہ اُن کی سیاسی تنظیم ہوئی۔ اُن کا تمدن وہی اسرائیلی ہے جو مصر سے انہوں نے اپنے ساتھ ایشیا کو چلتے وقت لیا تھا۔ یہ کوئی ۱۳۰۰ ق۔م کی بات ہوگی کہ انہوں نے اسیریا اور بابل کو اپنا وطن بنایا تھا۔ لیکن ایک عرصے کے بعد ۷۲۰ میں Shalmanezer نے اُن کے شیرازہ کو بکھیر دیا اور ۵۸۸ میں Nebuchadrezzar نے تو گویا اُن کا قلع قمع کرنیکی ٹھان ہی لی تھی۔ مگر حسن اتفاق سے ۵۳۸ میں جبکہ ایرانیوں نے بابل پر قبضہ جمایا۔ انہیں فلسطین میں یکجا ہونے کا موقع ہاتھ آیا۔ لیکن رفتہ رفتہ اُنہوں نے بابل کو بھی اپنا مرکز بنایا۔ اور بیت المقدس میں عام طور پر رہنے بسنے لگے۔ مگر جب وہ زمانہ آیا کہ بیت المقدس جنگ وجدال کا اکھاڑہ بنگیا تو انہیں اس موقع پر کافی تکلیفیں اُٹھانی پڑیں۔ نہ مسلماں اُن سے راضی تھے اور نہ عیسائی۔ مگر جوں توں کر کے انہوں نے اپنا گذارا کر ہی لیا۔ اور زمانہ کے ساتھ ساتھ فلسطین، شام ایشیائے کوچک میں انہوں نے اپنی آبادی بڑھانی شروع کی۔ یہاں قدم جما کر اُن میں کے بعضوں نے یونان، اطالیہ اور جرمنی کا رُخ کیا۔

اُن کا تمدن انفرادیت کا درجہ نہیں حاصل کرسکا اور شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کے مذہبی تعصب نے دوسری اقوام سے ملنے جلنے نہ دیا علاوہ اس کے معاشرتی اور معاشی نقطہ نظر سے اُن کی بخالت اور سودخواری کچھ اس طرح ان کی رسوائی کا باعث ہوئی کہ باوجود اسکے کہ وہ سالہا سال سے مقامات متذکرۂ بالا کو اپنا گھر بنائے ہوئے ہیں پھر بھی عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ غریب الوطن ہیں۔

عرب

حالانکہ عربوں کی تاریخ نویں صدی ق۔م سے شروع ہوتی ہے۔ مگر ظہور اسلام سے پہلے اُن کے تمدن کو ترقی نہ ہوئی تھی۔ اور نہ وہ اتنا وسیع ہوا تھا کہ اپنے ہمسایہ پر اثر انداز ہوتا۔ عرب کی تاریخ کا یہ حصہ زیادہ تر چند قبائل کے کارناموں پر مشتمل ہے۔ اُن کا تعلق اہل بابل اور یہودیوں سے نسلی حد تک کافی تھا۔ اور یہ بڑی حد تک سامی اثرات کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے
اسلام کا آغاز عرب کی تاریخ کا درخشاں باب ہے

اور یہی وہ زمانہ ہے جبکہ مختلف قبائل آہستہ آہستہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔ اور اجتماعی حیثیت سے قومی تمدن پیش کرنے کے قابل بنتے ہیں۔ اسلامی فتوحات نے اپنے ہمسایہ قوموں کے تمدنوں پر اپنے طور پر اثر کیا اور ساتھ ہی ان اقوام سے بھی جن سے انہیں سابقہ پڑا خود اثر قبول کیا۔ ہندوستان، ہسپانیہ مراکش اور جہاں کہیں مسلمانوں کا اُمنڈتا ہوا سیلاب پہونچا وہاں کے تمدن کی تاریخ کا ایک نیا ورق الٹا۔

بنو عباسیہ کی سلطنت سیاسی نقطۂ نظر سے کتنی ہی اہم ہو لیکن تمدنی نقطۂ نظر سے بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔ ہارون رشید کی علم پروری نے جو اسلامی تمدن کو پھیلانے میں مدد دی ہے وہ زبان زد خاص و عام ہے۔ ہسپانیہ پر اسلام کا جھنڈا جو صدیوں تک لہرایا وہ ایسا نہیں کہ یورپ کی تمدن کی تاریخ میں قابل ذکر نہ ہو۔ بغداد اور غرناطہ کی وہ علامتیں جن سے امارت و ثروت کے علاوہ تہذیب اور تمدن کی انتہا نظر آتی ہے اس قابل نہیں کہ فراموش کیجائیں۔

چین

جغرافیہ

رقبہ اور حدود اربعہ چین مشرقی ایشیا کا ایک بہت بڑا علاقہ ہے۔ مملکتِ چین میں خاص چین کے علاوہ منچوریا۔ منگولیا۔ تبت اور سن کیانگ بھی شامل ہیں۔ جنوب میں اس کا سب سے آخری علاقہ ۱۸° ۵۰َ شمال ہے۔ شمال میں ۵۳° ۲۵َ شمال مغرب میں ۷۴° اور مشرق میں ۱۳۵° مشرق ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ ۲۰° اور ۵۰° شمال اور ۸۰° اور ۱۳۰° مشرق میں واقع ہے۔ وہ سارے یورپ سے بھی رقبہ میں بڑا ہے۔ حالانکہ اس کا رقبہ قطعی طور پر معلوم نہیں لیکن صحت کے قریب ترین جو روایت ہے وہ ۲۷,۰۰۰,۰۰۰ اور ۴۳,۰۰۰,۰۰۰ مربع میل کے درمیان ہے۔ اِس کے شمال مغرب شمال اور شمال مشرق میں ایشیائی روس ہے جو تقریباً چھ سو میل تک اُس کو گھیرے ہوئے ہے۔ مشرق میں کوریا واقع ہے اور جنوب اور جنوب مغرب میں فرانسیسی ہندی چین۔ شمالی برما اور ہمالیہ واقع ہے۔

پہاڑ تبت کے مشرقی حصہ میں کیون لین کا سلسلہ بڑی دور تک چلا گیا ہے۔ مشرق مغرب میں جو پہاڑیاں شمال مغرب اور جنوب مشرق کی سمتوں میں پھیلی ہوئی ہیں انہیں لنگ شان، رشتوفن اور نان شان کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ رشتوفن کے سلسلہ کی بلندی بعض مقامات پر بیس ہزار فٹ سے بھی تجاوز کر جاتی ہے۔ اس کی چوٹیاں اکثر مقامات پر برف سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ سن شان اور کیولنگ کے سلسلہ میں بعض چوٹیوں کی اونچائی آٹھ ہزار اور گیارہ ہزار فیٹ کے درمیان ہے۔ فوکین میں جو کوہستانی سلسلہ ہے اس کی بلندی چھ ہزار پانچسو سے شروع ہو کر دس ہزار فیٹ تک بھی پہنچ جاتی ہے۔

ندی اور نالے چین میں ندیوں کی کمی نہیں ہے۔ بڑی ندیوں میں "یانگ سی کیانگ" اور "ہوانگ ہو" قابل ذکر ہیں آخر الذکر کی لمبائی تقریباً ۲۴۰۰ میل ہے۔ اس کی صرف ایک مشہور معاون "وی ہو" چین میں بہتی ہے۔ اس کا گذر "کان سو" اور وسط "شن سی" میں ہے "یانگ سی کیانگ" ملک کے بیچوں بیچ ہوتی ہوئی ۲۹۰۰ میل طے کرکے "زرد دریا" میں جا گرتی ہے دوسری ندیوں کے برخلاف اِس کا زیادہ حصہ جہاز رانی کے قابل ہے اور اسی وجہ سے اس کے کنارے پر بعض مشہور شہر آباد ہیں مثلاً نان کنگ۔ ان چنگ۔ کیو کیانگ۔ ہان کاؤ اور ای چانگ وغیرہ۔ "ہوائے ہو" مشرقی وسط چین میں ایک بڑی ندی ہے اِس کا گذر نان ہیو۔ سہا ہو اور نے ہو کے علاقو میں ہے اِسکی لمبائی تخمیناً آٹھ سو میل ہے۔ ندیوں کے بعد نالے چین کی سیرابی کا ذریعہ ہیں۔ "ین ہو" کا نالہ جسے یورپ میں عام طور پر "بڑا نالہ" کہا جاتا ہے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اسکی لمبائی تقریباً بارہ سو میل ہے "ہانگ چو" سے نکل کر یہ "تائے ہو" کی جھیل کے مشرقی حدود سے ہوتا ہوا "سوچو" کے خوبصورت شہر کے اطراف گذر کر
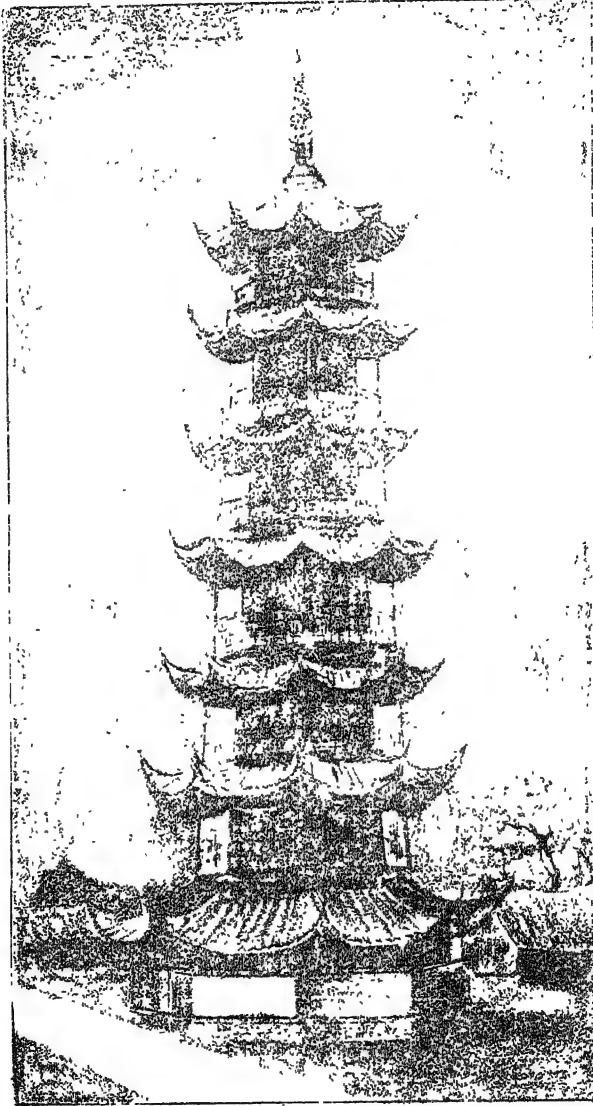
چین کا پگوڈا

"چن کیانگ" تک پہنچ جاتا ہے۔ اس پر بعض مشہور
پل بنائے گئے ہیں۔ اور کناروں پر اچھے اچھے
پگوڈا نظر آتے ہیں۔

آبادی چین کی آبادی بہت گنجان ہے لیکن صحت
کے ساتھ اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔
"شان ٹنگ" کا علاقہ آبادی کی کثرت کی وجہ سے
نمایاں ہے۔ یہاں کا اوسط ۶۸۰ فی مربع میل ہے۔ وسط
چین بہ نسبت دوسرے علاقوں کے زیادہ آباد نظر آتا
ہے اور یہیں کل چین کے تہائی لوگ آباد ہیں۔ آبادی
کا اوسط ۴۹۰ اور ۳۱۰ فی مربع میل کے قریب ہے۔

چینی حکومت کی طرف سے وقتاً فوقتاً پیکنگ
گزٹ میں آبادی کا تخمینہ شائع ہوتا رہتا ہے۔ لیکن
اعداد شمار کا طریقہ ناقص ہونے کے علاوہ کافی احتیاط
نہیں برتی جاتی اس لئے اکثر و بیشتر اختلافات دیکھنے
میں آتے ہیں۔ مسٹر پارکر نے رسالہ اعداد شمار میں
۱۸۹۹ء میں چینی موازنہ کا ترجمہ شائع کیا تھا۔ یہ سنہ ۱۶۵۱ء
اور سنہ ۱۸۶۰ء کے درمیانی اعداد شمار تھے۔ ان تخمینوں
سے صاف نظر آتا ہے کہ چینی آبادی بتدریج ترقی کرتی
رہی ہے تاآنکہ سنہ ۱۸۵۱ء میں ۴۳۲،۰۰۰،۰۰۰
تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے بعد سے برابر کمی ہونی شروع
ہوئی اور سنہ ۱۸۶۰ء تک ۲۶۱،۰۰۰،۰۰۰ رہ گئی محکمہ
کروڑگیری کا اندازہ سنہ ۱۹۰۶ء میں ۴۳۸،۲۱۴،۰۰۰
تھا لیکن تحقیقات سے پتہ چلا کہ یہ اندازے بڑی حد تک
غلط ہیں۔ مسٹر راک ہل جو پیکنگ میں امریکی وزیر ہیں
ایک عرصہ تک چینی آبادی کی صحیح تعداد معلوم کرنے کی
تلاش و جستجو میں رہے۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں انہوں نے واشنگٹن سے
ایک رپورٹ شائع بھی کی ہے جس میں انھوں نے مندرجۂ
بالا غلط اندازوں کی واقعات کے لحاظ سے تردید کی ہے۔
ان کے خیال میں سنہ ۱۹۰۴ء میں ۲۷۰،۰۰۰،۰۰۰ سے
زیادہ آبادی نہ تھی۔ اس بیان کے علاوہ دوسری تحقیقات
بھی زیادہ سے زیادہ ۴۰۰،۰۰۰،۰۰۰ تک پہنچتی ہیں۔

محکمہ کروڑگیری کے بیان کے مطابق سنہ ۱۹۰۸ء میں چین
میں غیر ملکیوں کی تعداد ۴۹،۸۵۲ تھی۔ ان میں ۴۴،۱۴۳
جاپانی تھے۔ ۲۰۵،۹ روسی۔ ۹۰۴۳ انگریز ۳۶۳۷
جرمن ۳۵۴۵ امریکن۔ ۳۳۵۳ پرتگالی۔ ۳۰۲۹
فرانسیسی۔ ۴۵۵ اطالوی اور ۲۸۲ بلجین تھے۔

زراعت چین بڑی حد تک زراعت پیشہ ملک ہے۔ اکثر
باشندوں کا ذریعہ معاش زراعت ہے۔
زمینداریاں بہت چھوٹی چھوٹی ہیں اور طریقہ زراعت
بہت قدیم اس لئے چینی کسان آسودہ حال نظر نہیں آتا
پانی کی فراوانی ہے اور آب رسانی کے ذرائع بھی کافی
اچھے ہیں۔

جانوروں کی نگہداشت اور ان کی پرورش خاص
فنی نقطہ نظر سے نہیں کی جاتی۔ عموماً کوہستانی علاقوں
میں جانوروں کی چراگاہیں مقرر ہیں اور یہیں زیادہ تر ان کی
پرورش کیجاتی ہے۔ بھیڑ۔ بھینس۔ گھوڑے۔ گدھے
اونٹ وغیرہ عام طور پر پالے جاتے ہیں۔ ان میں سے
بعض تو محض باربرداری کے کام آتے ہیں اور بعض
سواری کے اور کچھ زراعت کی ضروریات پوری کرتے
ہیں۔

جنگل کی نگرانی بھی عام طور پر دلچسپی کے ساتھ نہیں
کی جاتی لکڑی کی بڑھتی ہوئی ضروریات کیوجہ سے جنگل کے

جنگل کٹ گئے۔ لیکن اُن کی جگہ کسی اور نئے جنگل نے نہیں لی۔ سوائے خود رو درخت کے کوئی اور درخت خاص طور پر لکڑی کی تجارت کے لئے لگائے نہیں جاتے ہیں۔ البتہ پھلوں اور پھولوں کے درخت اس زمرے میں نہیں آتے کیونکہ چینی اُن کی ایک حد تک نگہداشت کر لیتے ہیں۔

پیداوار چین کی خاص پیداوار گیہوں، جَو اور مکئی ہے پھلیاں بھی مختلف قسم کی کثرت کے ساتھ پیدا کی جاتی ہیں "کان سو" کے بعض علاقوں میں "شان ٹنگ" کے جنوب میں اور "وے ہو" کے میدانوں میں چاول کی بھی کاشت ہوتی ہے۔ روئی "شن سی" اور "شان ٹنگ" کی پیداوار ہے اور بعض مقامات پر تمباکو بھی ہوتا ہے۔ نان ہو۔ کیانگ سی۔ ہونان۔ نیان وغیرہ کے علاقوں میں چاء کی کاشت کثرت سے ہوتی ہے۔ مئی میں تخم ریزی ہوتی ہے اور ستمبر میں کٹائی چینی چاء اپنے خاص ذائقہ کی وجہ سے ہر جگہ مشہور ہے۔

باغبانی چینی کسانوں کا ایک اچھا ذریعہ معاش ہے۔ سیب۔ ناشپاتی وغیرہ کثرت سے ہوتے ہیں۔ انکے علاوہ بھی نارنگیاں سنگترے۔ لیچی۔ آم۔ کیلے بھی وسطی اور جنوبی علاقوں میں نظر آتے ہیں۔

خشخاش چین کے تقریباً ہر علاقہ میں افراط کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ اِس کی کاشت خاص طور پر تجارتی نقطۂ نظر سے کی جاتی ہے۔ نیان۔ کانسو۔ شن سی۔ شان سی۔ شان ٹنگ۔ ہونان۔ کیانگ سو اور چھ کیانگ کے علاقوں میں ۱۹۰۶ء میں اُس کی پیداوار بہت زیادہ تھی۔ خشخاش چین کی بہت قدیم اور روایتی پیداوار ہے۔

سب سے پہلے اِس کا ذکر ابتدائے آٹھویں صدی عیسوی کے اَدب میں نظر آتا ہے۔ لیکن اِن دنوں اس سے افیون نہیں نکالی جاتی تھی۔ البتہ اُس کا استعمال دوائیوں میں ہوتا تھا لیکن سترہویں صدی عیسوی سے اس سے افیون نکالی جانے لگی۔ کچھ عرصہ بعد ۱۷۹۶ء میں جبکہ افیون کی درآمد ممنوع کر دی گئی چین میں افیون کی پیداوار دن دونی اور رات چوگنی بڑھتی گئی۔ ۱۹۰۶ء میں اس کی تجارت عروج پر تھی اور مشکل سے کوئی گھر ایسا ہوگا جہاں افیون پی نہ جاتی ہو لیکن رفتہ رفتہ اس کے مضر اثرات کو حکومت نے محسوس کیا اور آجکل افیون نوشی کو کم کرنے کے طریقے عمل میں لائے جا رہے ہیں۔

دھاتیں چین میں دھاتوں کی کمی نہیں ہے اور لوگوں کا خیال ہے کہ اس نقطۂ نظر سے چین کافی مالدار ہے لیکن غیر ملکیوں کو چین میں کان کنی کی اجازت نہیں ہے اور اگر بعض خاص صورتوں میں دی جاتی ہے تو شرائط بے حد سخت ہوتے ہیں اِس لئے معدنیات کی دریافت نہیں ہوئی۔

منچوریا کے علاقوں میں کوئلہ کثرت سے پایا جاتا ہے اور خاص چینی حدود میں بھی شان سی۔ ہونان وغیرہ میں کوئلہ کی افراط ہے۔ چھ لی۔ شان ٹنگ۔ شن سی ہوپے وغیرہ میں کوئلہ کی بڑی بڑی کانیں ہیں۔ لیکن ذرائع حمل و نقل کی دشواریاں اور غیر ملکی سرمایہ کا فقدان کان کنی کو فروغ دینے سے مانع ہیں "کے پنگ" کی کانیں غالباً ابتدائی کوششوں کا بار آور نتیجہ ہیں۔ تقریباً ....ر۔ ۵ ٹن کوئلہ سالانہ برآمد کیا جاتا ہے۔

لوہا بھی کافی مقدار میں ملتا ہے اور حسن اتفاق سے

جنوبی چین میں مچھلیاں کثرت سے پالی جاتی ہیں

خلیج بنگال
سیام
فرانسیسی
ہند
چین

کوئلہ کی کانوں کے پہلو بہ پہلو ہے۔ اس لحاظ سے اُس کو بہت کارآمد بنایا جا سکتا تھا لیکن سرمایہ کی قلت کی وجہ سے ہمیشہ یہ کام چھوٹے پیمانوں پر انجام پاتا رہا ہے۔ ہونان۔ فوکین۔ چھ کیانگ۔ اور شان ٹنگ میں لوہا زیادہ ملتا ہے۔

تانبے کے برآمد کرنے کے حقوق بحق سرکار محفوظ ہیں اور حکومت ہی کے ادارے اور محکمے اُن پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔ کیوچو اور ینیان میں یہ زیادہ پایا جاتا ہے۔

ٹین ینیان میں بہت پایا جاتا ہے اور اُس کی قیمت کا اندازہ ۱۹۰۸ء میں تقریباً ۶۰۰۰۰۰ پونڈ کیا گیا تھا جس سے اُس کی اہمیت کا صاف اندازہ ہو سکتا ہے۔

نمک شان سی کی باولیوں سے برآمد کیا جاتا ہے اور اِس کے علاوہ سمندر کے پانی سے بھی نکالا جاتا ہے۔

چینی حکومت نے "ہے نان" کے علاقے میں ایک سونے کی کان کھودی ہے۔ آمور ندی کی وادیوں میں بھی سونا پایا جاتا ہے۔ چاندی کی کانیں بھی ینیان میں پائی جاتی ہیں لیکن اِن قیمتی دھاتوں کو ابھی بڑے پیمانہ پر نہیں نکالا جا رہا ہے۔

ریشم مغربی اثرات سے پہلے چین کا ریشم سب سے زیادہ مشہور تھا۔ شہرت کے علاوہ نفاست اور پائیداری میں بھی بہت اچھا سمجھا جاتا تھا لیکن مغربی ریشم اصلی اور نقلی دونوں کا بازار میں کثرت کے ساتھ پایا جانا ایسا نہ تھا جو چینی ریشم کی تجارت کو ٹھیس لگائے بغیر رہ سکتا۔ پھر بھی کوئی کہہ نہیں سکتا کہ چینی ریشم آج اپنی خصوصیت کے وجہ سے باقی نہیں ہے۔ سوچو۔ نان کنگ اور ہانگ چو کے ریشمی کارخانے آج بھی کثرت کے ساتھ ریشم اور ریشمی کپڑے پیدا کرتے ہیں۔ حالانکہ چین کا ریشم زیادہ چین ہی میں خرچ ہو جاتا ہے لیکن بہر حال باہر بھی برآمد کیا جاتا ہے اور ایک اندازہ کے مطابق دنیا کا ۲۷ فی صدی ریشم چین ہی سے برآمد کیا جاتا ہے۔ شانگھائی۔ کیانٹن وغیرہ میں بڑے بڑے کارخانے نظر آتے ہیں جو بڑے پیمانہ پر ریشم کی تجارت کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۸۷۰ء میں ریشمی کارخانوں کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور اُسی زمانہ کے دستور کے مطابق اعلیٰ ترین ریشم جو پیدا کیا جاتا تھا وہ بادشاہ کے لئے مخصوص کر دیا جاتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کارخانوں کو اتنا فروغ ہوا کہ ۲۰۰۰۰۰۰ مزدور ان میں کام کرتے تھے۔ صحیح طور پر یہ بتانا تو قریب قریب ناممکن ہے کہ کتنے روپیہ کا ریشم چین سے ہر سال باہر جاتا ہے لیکن قریب ترین قیاس یہ ہے کہ تقریباً ۵۰۰۰۰۰ پونڈ کا ریشم باہر جاتا ہے۔

دیوارِ چین دیوار چین دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتی ہے۔ اِس دیوار کے آگے اسکاٹ لینڈ کی سرحد کی دیوار جسے "رومن وال" کہا جاتا ہے بچوں کے کھلونے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

یہ تقریباً دو ہزار میل لمبی ہے۔ اس کی موٹائی پندرہ اور اونچائی تیس فٹ ہے۔ اس کی تعمیر کی ابتداء

۲۱۹ سنہ ق۔م میں اور تکمیل پندرہ سال میں ہوئی۔ تین لاکھ سپاہی جنگی قیدی اور ملک کے سارے قیدی اس کی تعمیر میں مصروف تھے۔ ماہران ہیئت کے بیان کے مطابق زمین کی جو چیز چاند سے نظر آسکتی ہے وہ صرف دیوار چین ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ ممالک متحدہ برطانیہ کی ساری عمارتوں میں جتنا اینٹ اور پتھر صرف ہوا ہے اس سے زیادہ دیوار چین کی تعمیر میں خرچ ہوا۔ مورخین اس کو دنیا کی آٹھویں عجیب چیز خیال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری عجیب بات یہ ہے کہ دنیا کی ساری قدیم اور عجیب عمارتوں میں اہرام مصری کے ساتھ یہ بھی مکمل حالت میں باقی ہے۔

تاتاریوں کی مدافعت کے لئے یہ تعمیر کرائی گئی مگر موجودہ فن تعمیر باوجود اس قدر ترقی کر چکنے کے بعد بھی حیران ہے کہ دو ہزار میل کے نشیب و فراز پر اس کی تعمیر کس طرح ہوئی۔ در اصل جو چیز اسے عجوبہ روزگار بناتی ہے وہ یہی راز ہے۔

دیوار چین

چین کا پایہ تخت پیکن پیکن چین کا پایہ تخت ہے۔ یہ شہر تین ہزار سال سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ، لاکھ ہے۔

بعض مشہور شہر شنگھائی وادی ینگ سی کیانگ کا دروازہ اور بہت بارونق بندرگاہ ہے۔ یہ اپنی خصوصیت کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چین کا بڑا اسلحہ خانہ یہیں ہے۔ کانٹن سب سے بڑی تجارتی منڈی ہے۔ دریائے ینگ سی کیانگ کے کنارے اندرون ملک سب سے زیادہ آباد بستی ہے ٹینٹ سن پیکن کی بندرگاہ ہے۔ چین کی بڑی نہر یہاں تک پہنچتی ہے اور اسی کے ذریعہ زرخیز وادی ہی ہو کی پیداوار اس بندرگاہ تک پہنچتی ہے اور یہیں سے باہر جاتی ہے۔

تاریخ

تاریخ سے پہلے اس میں کوئی شک نہیں کہ چین دنیا کے

قدیم ترین مقامات میں سے ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس خطہ پر آبادی کا ظہور بہت پہلے ہوا اور یہاں تہذیب و تمدن نے اس وقت اپنا جلوہ دکھایا جبکہ آج کل کی دنیا کے بہت سے ممالک دریافت ہی نہیں کئے گئے تھے۔

لیکن اسی سلسلہ میں ایک بحث یہ چھڑ جاتی ہے کہ چینی کہاں کے اصلی باشندے ہیں۔ آیا انھوں نے یہیں جنم لیا یا شل دوسری قوموں کے جہاں گردی کے بعد یہاں ڈیرے ڈالے۔ چونکہ یہ زمانہ تاریخ سے پہلے کا ہے اسلئے قطعی تصفیہ ناممکن ہے مگر جہاں تک ملکی روایتوں کا تعلق ہے ان سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ چینی کہیں باہر سے نہیں آئے بلکہ وہ یہیں کے قدیم باشندے ہیں۔

اس قدیم ترین دور میں ہمیں جس ہستی کا انفرادی ذکر ملتا ہے اس کا نام "پان کوس" بتایا جاتا ہے۔ اس نام کے طرز کو پیش نظر رکھکر اگر آج ہم یہ غور کریں کہ چینیوں نے اپنی قومی روایتوں کو کس طرح باقی رکھا تو انتہا درجہ کی حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ آج بھی ہمیں اس قسم کے نام نظر آتے ہیں۔

پہلا شہنشاہ "فوہی" کو چینی اپنا پہلا شہنشاہ مانتے ہیں۔ اور اس کا زمانہ ۲۸۵۲-۲۷۳۸ ق۔م۔ بتاتے ہیں۔ اس سے چینی شہنشاہیت کی قدامت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ بعض روایتوں میں اس کو مافوق الفطرت ہستی بتایا گیا ہے لیکن زیادہ تر اسے گوشت پوست کا انسان سمجھتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے حلیہ کا اندازہ جو کیا گیا تو اس کے ایک دم مچھلی سے ملتی جلتی بتائی گئی اور اس کے اعضاء عجیب وغریب طریقہ پر بعض حیوانوں سے مشابہ دکھائے گئے۔

اس سے بحث نہیں کہ یہ روایت صحیح ہیں یا غلط۔ لیکن یہ تو ماننا پڑتا ہے کہ "فوہی" آجکل کے چینیوں کی صورت وشکل یقیناً نہ رکھتا ہوگا۔

"فوہی" سے قبل انسان جانوروں کی سی زندگی بسر کرتے تھے نہ انہیں تن بدن کا ہوش تھا اور نہ کھانے پینے کا۔ سماج اگر تھی تو اس میں صرف ماں کا بول بالا تھا اور باپ کو کوئی بچہ نہ جانتا تھا اس لئے کہ اخلاقی اور مذہبی قوانین ان دنوں تو آج کے جیسے سخت نہ تھے۔ "فوہی" نے جن لوگوں پر اپنی طاقت کا سکہ جمایا انہیں اس نے تہذیب وشائستگی سے بقدر ضرورت آشنا کیا۔ شادی بیاہ کی رسم اس نے ایجاد کی اور اس نے جانوروں۔ پرندوں اور مچھلی کے شکار کے طریقے بتائے۔ لوگوں کو خاندانوں میں تقسیم کیا۔ اور ہر خاندان کا سردار باپ کو کیا۔

مذاہب چین میں مذہب نے بہت پہلے گھر کیا۔ یہاں تہذیب وتمدن کے ساتھ مذہب بھی پرورش پاتا رہا۔ حالانکہ یہ بتانا مشکل ہے کہ کس مذہب نے پہلے جنم لیا۔ اس وجہ سے کہ اس زمانہ میں مذہب کے نام نہوا کرتے تھے بلکہ اس کے اصول اور طریقوں کو رواج دیا جاتا تھا۔ دیویوں اور دیوتاؤں کا ایک سلسلہ لامتناہی تھا اور ان کی پرستش ایک خاص رسم ورواج کے ماتحت ہوا کرتی تھی۔

طائیت رفتہ رفتہ جب لوگوں میں تمدن کا اتنا اثر ہوا کہ وہ دوسری دنیا کی بابت سوچنے لگے تو انہیں سب سے پہلے نیکی اور بدی کا خیال ہوا تھا

ہی سزا اور جزا کا سوال بھی پیدا ہوا۔ "لاؤ طو" یا "لاؤ طزے" ایک شخص فلسفہ مذہب پر غور کرنے لگا اور اس نے جو اصول مذہب کے نام سے بنائے اسے چینی مذاہب کی تاریخ میں "طائیت" کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ "وحدت الوجود" کے قریب قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کے لحاظ سے یہ زندگی فانی سمجھی گئی اور بقا دوسری دنیا میں خیال کی گئی ہے اور یہاں کی ساری تگ و دو اسی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے سمجھی گئی جسے حیات جاویداں کہا گیا۔

بدھ مت کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ 'منگ تی' (۵۸ ۔ ۷۶ء) نے ایک رات خواب میں ایک سنہری انسان کو دیکھا اور اس کے بھائی نے اسے بتایا کہ یہ ہستی سوائے گوتم بدھ کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی لوگ بدھ مت سے ناآشنا نہ تھے۔ بلکہ بعض محققین کا خیال ہے کہ چین میں بدھ مت ۲۱۷ ق۔م میں پہنچ چکا تھا۔ اور بعضوں نے اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ قصہ یوں لکھا ہے کہ چند سیاح چین پہنچے تھے لیکن حکومت وقت نے ان پر شبہ کر کے انہیں قید کر دیا لیکن وہ رات میں رہا ہو گئے۔ دربان سے دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ رات جب زیادہ ہو گئی تو ایک سنہری مورت زندان کے دروازہ پر نظر آئی اور اسی نے دروازہ کھولا اور تمام قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اور یہی رہا شدہ قیدی بدھ مت کی تبلیغ کرنے لگے۔

اسلام چین میں اسلام کے پھیلنے کے متعلق بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔ چینی مسلمانوں کی لکھی ہوئی تاریخوں میں بھی دو مختلف روایتیں نظر آتی ہیں۔ ایک کی رو سے چین میں مسلمان خشکی کے شمال مغربی راستہ سے داخل ہوئے اور دوسری کے لحاظ سے مسلمانوں کا ورود بحری راستہ سے ہوا۔ دونوں روایتوں میں پیغمبر اسلام کا سفیر ایک ہی شخص ہے اور اس کا نام سعد وقاص بتایا گیا ہے۔ اس سفیر کی آمد کا زمانہ اندازاً ۵۸۶ء کے لگ بھگ سمجھا گیا۔ مگر غور طلب بات یہ ہے کہ موجودہ سن کی مطابقت کے لحاظ سے جو صحیح تسلیم کیا جاتا ہے آنحضرتؐ کی ولادت ۵۷۰ء میں ہوئی اور آپ نے چالیس برس سے پہلے تبلیغ شروع ہی نہیں کی تھی۔ چہ جائیکہ سولہ برس کی عمر میں اسلام پھیلانے کے لئے سفیر روانہ کرتے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان چین میں تجارت کے سلسلہ میں پہنچے اور اسی وجہ سے وہ ایک عرصہ تک وہاں مستقل طور پر سکونت نہیں اختیار کر سکے۔ پہلا سیاح جس نے تاریخی واقعات پیچھے چھوڑے ہیں ۸۵۱ء میں چین پہنچا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق عرب تجارت کی غرض سے چین آتے جاتے تھے اور اسی لحاظ سے ان کے مذہب کا کوئی زیادہ اثر ملک پر دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس کے بعد ہی دوسرا سیاح جو چین پہنچا اور جس کا بیان اس سلسلہ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے 'ابو زید' ہے۔ یہ ۸۷۷ء میں چین پہنچا۔ اس نے ایک عرب کی داستان بڑے مزے سے سنائی ہے۔ جو چین میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو چکا تھا۔ اس کا نام 'ابن وہاب' تھا اور یہ "سیان فو" شہنشاہ چین سے مل چکا تھا۔ شہنشاہ نے اس کی بڑی آؤ بھگت بھی کی تھی۔

یہ خیال اب یقین کی حد تک پہنچ چکا ہے کہ اسی

"ابن وہاب" کو چینی مسلم مورخوں نے غلطی سے "ابن وقاص" لکھا کیونکہ آنحضرت صلعم کے ماموں ابو وقاص نے کبھی عرب سے باہر قدم نہیں رکھا اور نہ اُن کے فرزند "سعد ابن وقاص" نے چین کا سفر کیا۔

بہرحال مسلمانوں نے ۶۵۱ء میں چین میں پہلا قدم رکھا لیکن اُن کی سکونت کو اہمیت ۷۵۵ء میں اس وقت حاصل ہوئی جبکہ خلیفہ "ابو جعفر" نے ۴۰۰ عرب فساد مٹانے کے لئے چین روانہ کئے اور وہ یہاں پہنچکر سکونت پذیر ہوئے۔ انھوں نے شادیاں کر کے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کیا اور وقعت حاصل کی۔

چین میں مسلمانوں کی تعداد کے متعلق مختلف روائتیں ہیں چالیس لاکھ سے لیکر تین کروڑ تک بھی کہا جاتا ہے، مردم شماری کی صحیح رپورٹ کی عدم موجودگی کی وجہ سے کوئی قطعی تعداد تو معین نہیں کی جا سکتی البتہ یہ ضروری ہے کہ کان سو۔ نیان پہ چھی ہی۔ خاص چین۔ سن کیانگ اور چینی ترکستان میں شمال مغربی سرحد پر مسلمانوں کی تعداد دوسرے حصوں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔

عیسائیت ۶۳۱ء میں ایک تبلیغی جماعت عیسائیت پھیلانے کے لئے چین پہنچی۔ ۶۳۶ء میں کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ نے اس جماعت کے پیشوا کو باریابی کا شرف بخشا، اور مذہبی بحث و مباحثہ کے بعد اجازت دی کہ تبلیغ عام کی جا سکتی ہے۔ اس وقت سے برابر تبلیغ کا سلسلہ جاری رہا۔ رومن کیتھولک فرقہ کے بعد جب پراٹسٹنٹ زاویۂ نگاہ کو اہمیت حاصل ہوئی تو ایک جماعت اُس کی تبلیغ کے لئے بھی کمربستہ ہوگئی۔ چنانچہ ۱۸۶۰ء تک اُنہیں اتنی آزادی ملگئی کہ بیشمار گرجے دونوں فرقوں نے تعمیر کرائے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ ۱۹۰۰ء میں دس لاکھ کے قریب افراد اول الذکر فرقے کے گرجوں کے رکن تھے اور تقریباً ڈھائی لاکھ آخر الذکر فرقے کے گرجوں کے رکن۔

یہودیت یہودیوں کی چین میں آمد کے متعلق بھی بڑی دلچسپ روائتیں مشہور ہیں اور اُن کا آغاز ساتویں صدی قبل مسیح سے ہوتا ہے۔ اِسی سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بابل کی فتح کے بعد تقریباً ۷۲ء میں اُنہوں نے "ہونان" نامی ایک نوآبادی بسائی تھی۔

لیکن تاریخی نقطہ نظر سے یہودیوں کی آمد کی تاریخ ۱۱۶۳ء مقرر کی جاتی ہے۔ ایک عرصہ تک اُنہوں نے بڑی آرام کی زندگی گذاری اور چینی حکومت نے ہر طرح کے مراعات اُنہیں دے رکھے تھے لیکن جوں ہی عیسائیوں کا زور شروع ہوا اُن کی کمزوری کے آثار رونما ہونے لگے رفتہ رفتہ سترھویں صدی عیسوی میں اُن کی حالت بہت خراب وخستہ ہوگئی اور اس کے بعد سے مسلسل روز بروز اُن میں انحطاط ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بالکل ہی کس مپرسی کے عالم میں دن گذار رہے ہیں۔

جمہوریت چین جو تاریخ کی ابتداء سے شہنشاہیت کا گہوارہ تھا بالآخر ۱۹۱۲ء میں اُس نے جمہوریت کا جھنڈا بلند کر دیا۔ یورپ میں جو انقلاب صدیوں میں ہوا وہ چین میں دفعتاً ظہور پذیر ہوا۔ ظاہری حالت دیکھکر کون کہہ سکتا تھا کہ اُس کی کایا پلٹ یوں ہوگی اور وہ اِس قدر جلد مغربی طرز حکومت صدیوں کی روایتوں کو توڑ کر اختیار کرلیگا۔ لیکن چین کی سیاسی حالت اب بھی قابل اطمینان نہیں ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھیگا؟

صدیوں سے چین دوسری اقوام کا شکار بنا ہوا ہے آئے دن کوئی نہ کوئی اُس کا گلا دبوچنے کی فکر میں لگا رہتا ہے برطانیہ اور فرانس کے مقابلہ میں ایک مدت ہوئی اُسے ہتیار اُٹھانا پڑا تھا۔ ۱۸۹۴ء میں جاپان نے اُس کو شکست فاش دی تھی۔ ۱۸۹۸ء میں جرمنی نے کیوچاؤ اور برطانیہ نے "وے ہائی وے" پر قبضہ جمایا اور اسی کے دوسرے ہی سال روس نے بندرگاہ "آرتھر" چھین لی۔

جاپان چین کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے کیونکہ وہ اس کا بغلی دشمن ہے پچھلے دس سال سے یہ دشمنی خطرناک حد تک پہنچ چکی ہے اور اگر ۱۹۳۲ء میں دوسری اقوام نے چین کی طرفداری نہ کی ہوتی تو اس کے ایک بڑے خطہ پر جاپان کا پرچم لہرا چکا ہوتا۔

نئی تعلیم

دور قدیم میں چینی تعلیم کے عجیب طریقے مشہور رہے یوں بھی چینی دنیا کی نظروں میں ایک راز ہیں۔ اُن کی طرز معاشرت، اُن کی تعلیم اُن کی طرز حکومت اور اُن کے سزا و جزا کے طریقے بھی عجیب متحیر کن ہیں لیکن رفتہ رفتہ وہ اپنے قدیم عادات واطوار چھوڑ کر نیا جنم لے رہے ہیں خصوصاً جمہوریت کے بعد اُن میں غیر معمولی تبدیلیاں بہت جلد واقع ہوئیں۔

تعلیم آج کل عام ہو چکی ہے اور اُس سے متعلق سارے راز ہائے سربستہ فاش ہو چکے ہیں۔ اور اُس کے پھیلانے کے بالکل سیدھے سادے طریقہ عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ حالیہ اعداد شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۳۴۰۰۰ مدرسے ہیں اور اُن میں تقریباً ۴۸۰۰۰۰۰ طلبا تعلیم پاتے ہیں۔

حالانکہ کہا جاتا ہے کہ چینی حروف تہجی قدیم ترین رسم الخط میں شمار کئے جاتے ہیں لیکن اُن کی زیادتی عام فہم اور قابل عمل بنانے میں روڑے اٹکاتی رہی۔ رفتہ رفتہ اُن میں ضرورتاً کمی ہوتی رہی تا آنکہ حالیہ اطلاع کی بموجب اُن کی تعداد اب صرف ۳۹ تک پہنچ گئی اور شاید یہی وجہ ہے کہ اب چین میں تعلیم زیادہ عام ہو رہی ہے

چینی عورت

تعلیم کے ساتھ ہی عورتوں کی حالت بڑی حد تک درست ہوگئی اور ان کی چھینی ہوئی آزادی دوبارہ واپس کر دی گئی۔

گذشتہ زمانہ میں شادی کے معاملات میں ماں باپ ہی کی آواز سب سے بلند رہتی تھی اور اُن ہی کا فیصلہ قطعی سمجھا جاتا تھا۔ وہ جس سے چاہتے اپنی اولاد کا دامن باندھ دیتے اور کسی کی مجال نہ تھی جو اُف تک کرتا۔ مگر اب شادی بیاہ کا سوال زندگی کا اہم ترین سوال سمجھا جا چکا ہے اور دولہا دولہن کی رضامندی کو کافی اہمیت دی جانے لگی ہے۔

عورت کو ابتدائی زمانہ سے اُمور خانہ داری کی تعلیم دی جاتی ہے اور اُس کی کارگزاریوں کو چاردیواری تک محدود رکھا جاتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ چینی ذہنیت کے انقلاب میں عورت نے بھی برابری کا حصہ لیا اور بہت سی عورتیں اس قابل ہیں کہ اُنہیں مردوں کے دوش بدوش کھڑا کیا جائے۔

مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کا بھی چرچا ہوا اور بہت تھوڑے عرصہ میں تقریباً تین ہزار مدارس ابتدائی تعلیم کے لئے قائم ہوئے۔

تعلیم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں آداب معاشرت بڑی سختی کے ساتھ سکھائے جاتے ہیں۔

اُن میں سے بعض کا ذکر مثال کے طور پر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

"کھانے میں آواز نہ کرو۔ ہڈیوں کو دانتوں سے نہ جھنجھوڑو۔ جس ٹکڑے کو تم کتر چکے ہو اسے واپس نہ رکھو۔ ہڈیوں کو کتوں کے آگے نہ پھینکو۔ کسی کھانے کی شئے کو دوسرے سے مت چھینو۔"

دورِ جدید میں پرانی تہذیب کو پس پشت ڈال دیا گیا اور نئی مغربی طرز کو مروج کیا جا رہا ہے۔ مثلاً زمانہ قدیم میں ہیٹ اوڑھے رہنا ادب و لحاظ کی نشانی تھی لیکن مغرب کی پیروی میں اُس کے برعکس عمل ہو رہا ہے۔ اسی طرح پرانے لوگ ملاقاتی کارڈ نو انچ لمبا اور سرخ رنگ کا رکھتے تھے مگر اب یہی سیدھا سادا سفید چھوٹا سا کارڈ عام طور پر استعمال ہو رہا ہے۔

سلام کرنے کے خاص طریقے اب بھی وضع کے پابند بوڑھے عمل میں لاتے ہیں اور اس قدر جھکتے ہیں اور اتنی انکساری عیاں کرتے ہیں کہ نئی روشنی کے نوجوان اس کو ایک تماشہ سمجھنے لگے ہیں۔ خصوصاً جب یہ سماں راستوں پر نظر آتا ہے تو اور بھی پُر لطف ہو جاتا ہے۔ مہمانداری میں بھی چینی بے حد خلوص اور انکسار برتتے ہیں۔ وہ کبھی اپنے مہمان کو ناراض نہیں دیکھ سکتے۔

چھوٹے پاؤں چینی عورتوں کے پاؤں عموماً چھوٹے ہوتے تھے اور یہ زمانہ قدیم میں حسین رواج سمجھا جاتا تھا۔ اُس کی ابتداء کے متعلق ۹۳۰ء تک روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ابتداء میں چھوٹے پاؤں اس بات کی نشانی تھی کہ یہ عورت بڑے گھرانے کی ہے اور اُسے محنت مزدوری کی چنداں فکر نہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ فیشن عام ہوتا گیا اور ہر عورت نے کم و بیش اُس کو حسن سمجھ کر اختیار کر لیا۔ عام طور پر چار انچ کی لمبائی معیار حسن قرار دی گئی مگر بعض سخت جان عورتوں نے تو اپنے پاؤں ڈھائی انچ تک چھوٹے رکھے جو حیرت انگیز نظر آتے ہیں۔

یوں بھی نزاکت چینی عورت کا سب سے زیادہ دل لبھانے والا زیور سمجھی جاتی تھی لیکن چھوٹے پاؤں عورت کے حسین ترین اعضا تسلیم کئے جاتے اور اُن کی زندگی میں یہ فقرہ روزمرہ سا ہو گیا تھا کہ "عورت کی خوبصورتی دیکھنی ہو تو اُس کے پاؤں دیکھو"۔

لیکن عصرِ جدید میں تعلیم اور آزادی نے جو نئی روح پھونکی اُسی کے باعث وہی شئے جو کبھی حسن تھی اب قبیح قرار دی گئی۔ پاؤں کو عمداً چھوٹے رکھنا بے جا معصیت کا شکار ہونا سمجھا گیا اور علاوہ اِس کے حسن کا معیار بھی پاؤں کے چھوٹے ہونے کو قرار نہیں دیا گیا۔ اسی سبب سے اب عورتیں اپنے پاؤں کو چھوٹے کرنے کی فکر نہیں کرتیں۔

عادات و اطوار چینی ایماندار، محنتی، نیک دل اور سخی ہوتے ہیں اُن کا انکسار اور اُن کی تواضع زبان زدِ خاص و عام ہے۔ فطرتاً اُن کی طبیعت میں ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ دراصل اخلاق کی نمایاں خصوصیتیں اُنھیں اپنے قدیم مذہب سے حاصل ہوئیں جس نے ابتداء میں اُنہیں نیکی اور ہمدردی کی طرف راغب کر لیا۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مذہبی اصول چاہے وہ کسی مذہب کے کیوں نہ ہوں اخلاقی نقطۂ نظر سے بہت سخت ہوتے ہیں اور جو قوم مذہب کی پابندیوں کی عادی ہوتی ہے وہ لازمی طور پر فلسفۂ اخلاق پر دستگاہ رکھتی ہے اور اُس کی پیروی بھی مثل مذہبی اصول کے کرتی ہے۔

چینی آج بھی دوسری اقوام کے لئے ایک رازِ سربستہ ہیں

اُن کی بہت سی عادتیں اور اُن کے بشیار افعال عام طور پر آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے چین میں مجرم اپنی اس خصوصیت کو انتہا تک پہنچاتے ہیں۔ ساری دنیا چینی مجرموں سے خائف ہے۔ اُن کے ارتکاب جرم کے نئے طریقہ اور اس کی پردہ پوشی کے بہتر کن انداز افسانوی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی حکومت چین ان مجرموں کو جو سزا دیتی ہے وہ بھی عجیب وغریب ہوتی ہے۔

جہاں عوام کے عادات واطوار اخلاقی نقطۂ نظر سے بلند ہیں وہاں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ حکومت کے عہدہ دار عموماً بدخصلت ہوتے ہیں۔ رشوت کی بعض دلچسپ حکایتیں آئے دن سننے میں آتی ہیں اور اُن کی برائیوں کے افسانے مشہور ہیں۔

جاپان

جغرافیہ

سلطنت جاپان میں کوریا۔ جزائر کورائل۔ جزائر جاپان جزائر لوچو۔ فارموسا اور سکھالین شامل ہیں۔ ان میں تین جزیرے خاص جاپانی سمجھے جاتے ہیں۔ ایک ہونشیو دوسرا کیوشیو اور تیسرا شکوکو۔

رقبہ اور آبادی جاپان اور اس کے سارے مقبوضات کا مجموعی رقبہ تقریباً ۲۶۰٫۷۳۸ مربع میل ہے۔ اور آبادی ۱۹۲۳؁ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے لحاظ سے ۵۹٫۵۰۰٫۰۰۰ اور حالیہ اطلاعات کی بموجب نو کروڑ نوے لاکھ کے قریب پہنچ گئی ہے۔ اسی تیز رفتاری کو پیش نظر رکھکر عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جاپان کی ہتیلی پر اسکی آبادی کی سرسوں کسی طرح جمتی نظر نہیں آتی۔ اس لئے اُسکی ممکنہ کوشش یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ نازک سوال حل ہوجائے اول وہ چاہتا تھا کہ جو غیر آباد زمین اُفتادہ حالت میں پڑی ہے اُس کو کام میں لائے اور دوسرے یہ کہ ہمسایہ ممالک میں جاپانیوں کو آباد ہونیکا حق ملے اور اگر یہ نہ ہوسکے تو نو آبادیاں تلاش کرے۔ اسی جد وجہد میں وہ ہمسایہ ممالک پر للچائی ہوئی نظریں ڈالتا ہے خصوصاً چین کے بعض علاقوں پر وہ قبضہ کرنے کی ہر آن سونچتا رہتا ہے مگر یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ آج تک جاپان کو اپنے مندرجہ بالا مقاصد میں کامیابی نصیب نہ ہوئی اِسیوجہ سے آبادی کا سوال ہنوز اس کے لئے پریشان کن ہے۔ لے دے کے اب "منچوکو" میں جاپانیوں کے داخلہ کی عام اجازت ہوگئی ہے اور وہاں بہت سے مراعات حاصل ہوگئے ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ "منچوکو" کی آب وہوا جاپانیوں کے موافق نہیں۔

اِسی سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ مشہور رہے۔ پچھلے دنوں جب چین اور جاپان کے تعلقات بہت خراب ہوگئے تھے کسی سیاح نے اپنے ایک جاپانی ہم سفر سے دریافت کیا:۔

"کیا سبب ہے کہ جاپان ہمیشہ کسی نہ کسی سے

لڑنے کے لئے ہر وقت کمربستہ نظر آتا ہے۔ روس سے الگ چھیڑ چلی جاتی ہے اور چین سے الگ جنگ۔"

جاپانی نے جواب دیا:-

"بات یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کا سوال جاپان کے لئے اتنا تشویشناک ہوگیا ہے کہ جنگ ہی اُس کا واحد حل سمجھا گیا۔ اگر فتح ہو تو مقبوضات ہاتھ آئیں گے جہاں جاپانی کثیر تعداد میں آباد ہو سکتے ہیں اور اگر شکست ہو تو بے ضرورت آبادی کا بہت سا حصہ چھٹ جائیگا۔"

فوجیاما "فوجیاما" جاپان کا سب سے مشہور پہاڑ ہے۔ یہ دریا کے کنارہ واقع ہے اور اُس کی اُونچائی تقریباً دو میل ہے۔ اس کی چڑھائی جتنی دلچسپ ہے اتنی ہی مشکل بھی اور چوٹی پر پہنچنے کے لئے متعدد گھنٹوں تک مسلسل چڑھنا پڑتا ہے لیکن ایک دفعہ اُوپر پہنچ چکنے کے بعد جو منظر آنکھوں کے آگے آتا ہے وہ کچھ اِس قدر جاذب نظر ہوتا ہے کہ نیچے آنے کے لئے جی نہیں چاہتا۔ سیاح عموماً اس پر چڑھتے ہیں اور گو کہ جاپان یوں بھی عام طور پر بڑے دلفریب مناظر پیش کرتا ہے لیکن یہاں کا سماں کچھ اور ہی ہوتا ہے اسلئے ہر سیاح اس کا ذکر خاص طور پر کرتا ہے۔

جاپان زلزلوں کا ملک ہے یہ خیال عام طور پر مشہور رہے کہ جاپان زلزلوں کا ملک ہے اور یہ کچھ خلاف حقیقت بھی نہیں کیونکہ آئے دن بے شمار جاپانی اس بلائے مبرم کی نذر ہوتے ہیں یہاں تک کہ لوگوں نے اب زلزلوں کا لحاظ اپنی زندگی میں اتنا رکھا ہے کہ اُنکے ہاں کی ہر گھریلو چیز زلزلے سے زیادہ متاثر ہونے والی نہیں ہوتی۔

۱۸۹۶ء میں ۲۷،۰۰۰ جانیں تلف ہوئیں اور ۱۹۲۳ء میں توکیو اور یوکوہاما بالکل ہی زمین کے برابر ہوگئے۔ اُن کے علاوہ چھوٹے چھوٹے زلزلے تو اتنی تعداد میں ہوتے ہیں کہ جاپانیوں کی زندگی میں یہ ادنیٰ نشیب و فراز سمجھا گیا۔

کوہ آتش فشاں جاپان میں بیس کوہ آتش فشاں ہیں۔ اور یہ اکثر برابر آگ اُگلتے رہتے ہیں۔ اِن کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لئے جاپانی اپنے مکان عموماً لکڑی یا اُسی قسم کی ہلکی اشیاء سے بناتے ہیں تاکہ اُن کے گرنے سے زیادہ جانیں تلف نہوں۔ لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ اِس قسم کی اشیاء بہت جلد شعلوں کے اثرات قبول کرلیتی ہیں اور بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ مکانات میں دب کر لوگ نہیں مرتے بلکہ جلکر مرتے ہیں۔

"اسامہ" کا آتش فشاں پہاڑ بہت مشہور ہے اور سیاح عموماً اس کی سیر ضرور کر لیتے ہیں۔ اِس کی اُونچائی کوئی آٹھ ہزار فیٹ ہوگی۔ آتش فشاں کے دہانہ پر دہکتی ہوئی آگ کا ایک بڑا سا ڈھیلا نظر آتا ہے۔ اُس کے اطراف جلتے ہوئے پتھر پگھلتے نظر آتے ہیں۔ چاروں طرف گندھک کا دُھواں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔

آج سے تقریباً سو سال پہلے اپنی زور کی آتش باری ہوئی تھی کہ پہاڑ سے لاوا نکل کر کئی میل تک بہتا گیا تھا۔ آج بھی جو لاوا اس پہاڑ سے بہتا ہے وہ بہت دور تک نظر آتا ہے اور اسی سبب سے اس پہاڑ کے ارد گرد آبادی کا پتہ نہیں۔

کساتسو کے گرم چشمے گرم چشمے اگرچہ کہ "ہاکونے" "اتامی" اور "نکو" میں بھی کثرت سے ہیں لیکن کساتسو کے گرم چشمے زیادہ مشہور ہیں۔ یہاں

گندھک کا کھولتا ہوا پانی ہر جگہ بہتا نظر آتا ہے اور ہر جگہ نلوں کا جال بچھا ہوا ہے ان نلوں کے ذریعہ ہوٹلوں میں پانی جاتا ہے اور لوگ وہاں اس پانی سے غسل کرتے ہیں چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں لوگ عام طور پر دواؤں کی تھلیاں چھوڑتے ہیں اور جب وہ اس گندھک کے پانی سے متاثر ہو چکتی ہیں تو انہیں استعمال کرتے ہیں۔

تو دائجی

"تو دائجی" کے معنی مشرقی عالی شان مندر کے ہیں۔ یہ مندر شہر "نارا" میں ہے۔ اس کی عمارت دنیا کی سب سے عالی شان چوبی عمارت سمجھی جاتی ہے۔ اس میں گوتم بدھ کا بت نصب ہے جسے "دائی بتسوجی" کہتے ہیں اور یہ شاید دنیا کا سب سے بڑا تانبے کا بت ہے۔ اس کا قد ۵۳ فیٹ، چہرہ کی لمبائی ۱۶ فیٹ، چہرہ کی چوڑائی ۹ فیٹ ۶ انچ، ناک کی بلندی ایک فیٹ ۶/۵ انچ، دہانہ ۳ فیٹ ۸ ۱/۲ انچ، کان کی لمبائی ۸ فیٹ ۶ انچ، انگوٹھے کا گھیرا ۴ فیٹ ۹ ۳/۵ انچ ہے۔

اس بت کی ساخت کے لئے ۴۳۷ ٹن کانسی، ۲۸۸ پونڈ سونا، ۷ ٹن موم، ۱۶۵ پونڈ پارہ اور کئی ہزار ٹن کوئلہ صرف ہوا تھا اور پورے دو سال کی مدت۔

یہ مندر ۷۴۳ء میں شہنشاہ "شوموتو" کی خواہش پر تیار ہوا تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس کا سنگ بنیاد خود شہنشاہ نے رکھا تھا۔ لیکن زلزلے میں اس کی عمارت کو بہت نقصان پہنچا تھا اس لئے ۱۷۰۸ء میں اس کی تعمیر از سر نو ہوئی۔

اس مندر کے احاطہ میں ایک قدیم عمارت ہے جس کا نام "شوسوین" ہے جس کے معنی خزانہ کی عمارت ہیں۔ اس کے اندر نہایت بیش قیمت سامان ہے جو بارہ سو برس سے اس میں رکھا ہوا ہے۔

"ہوریوجی" مندر

۶۰۷ء میں "شوتوکوتائشی" نامی ایک شہزادے نے "ہوریوجی" کا مندر شہر "نارا" میں بنوایا تھا۔ یہ جاپان کا سب سے قدیم بدھ مندر ہے۔ اس کی دیواروں پر جو گوتم بدھ کی تصویریں اور دوسرے نقوش ہیں وہ قدیم جاپان کی نقاشی کا اعلیٰ ترین نمونہ خیال کئے جاتے ہیں اور ان کی وہی اہمیت ہے جو ہندوستان میں اجنٹا اور ایلورا کی ہے۔

مشہور شہر

"ٹوکیو" جاپان کا دارالخلافہ ہے اور دنیا کا پانچواں بہترین شہر۔ اس کی تعمیر نہ بالکل ہی جاپانی طریقہ پر ہوئی اور نہ پوری طرح مغربی بلکہ مغرب و مشرق کی آمیزش کا یہ ایک عظیم الشان کارنامہ نظر آتا ہے۔ اس کی آبادی بیس لاکھ سے زیادہ ہے۔ یہ کچھ زیادہ قدیم شہر نہیں ہے کیونکہ ۱۶۰۳ء میں جاپان کے دو دارالخلافے تھے۔ ایک "کیوٹو" جو مغرب میں میکاڈو کے قبضہ میں تھا اور دوسرا "ایڈو" جس پر شوگن کا تسلط تھا۔ لیکن ۱۸۶۸ء کے بعد جب شوگن کا قلع قمع ہو گیا تو "ایڈو" میکاڈو کے قبضہ میں آگیا اور اسی زمانہ سے اس کا نام "ٹوکیو" رکھا گیا۔

"کیوٹو" جاپان کا بہت خوبصورت شہر ہے اور حالانکہ یہاں بے شمار کارخانے ہیں اور ان کے دھوئیں سے فضا تھوڑی بہت مکدر ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی حد درجہ فرحت بخش جگہ ہے۔ یہاں کے قدرتی مناظر کاروباری زندگی کو اور بھی خوشگوار بناتے ہیں اور اطراف و اکناف کے کاریگر سب اکٹھے نظر آتے ہیں۔ مگر کاریگروں کی دوکانیں اور کارخانے سب کے سب خاص جاپانی طرز کے ہیں۔

جاپان کی صنعتیں

بحیرۂ زرد
کوریا
جہازسازی
سان فرانسسکو سے ۴۷۶۰ میل
ہانگ کانگ سے ۱۵۸۰ میل
جہاز کی صنعت
برتن سازی
کافور
وہیل
کوپرا
فارموسا
کوئلہ
پٹرولیم
شکر
بحرالکاہل

"نارا" ۷۰۹ء میں جاپان کا پایۂ تخت تھا۔ یہ اپنے مشہور مندروں تودائجی اور ہوریوجی کی وجہ سے کافی شہرت رکھتا ہے۔

"کوبے" جاپان کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ اس کی اہمیت ۱۸۶۸ء میں معلوم ہوئی۔ یہاں کی آب و ہوا بڑی خوشگوار ہے اور جاپانی عموماً تبدیل آب و ہوا کیلئے آتے ہیں

"ناگاساکی" ایک قدیم شہر ہونے کے علاوہ جہازوں کے کارخانوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہیں جاپان کے سارے جہاز بنتے ہیں۔ اِس کے علاوہ مذہبی تہواروں کے لئے بھی یہ مقام جاذب نظر ہو جاتا ہے۔ خصوصاً "مُردوں کا میلہ" جو ۱۳ اور ۱۵ جولائی کے درمیان ہوتا ہے یہاں بڑے دُھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ ۱۵ جولائی کی شام کو ایک دلچسپ نظارہ دیکھنے میں آتا ہے۔ لوگ چھوٹی چھوٹی پھوس کی کشتیاں لئے اُن پر کاغذ کے بادبان چڑھائے پھل اور حلوا وغیرہ رکھے پانی کے کنارے جمع ہوتے ہیں اور اُن میں رنگین چراغ روشن کر کے پانی میں چھوڑتے ہیں۔ جب یہ کشتیاں ہزاروں کی تعداد میں پانی کی سطح پر تیرتی نظر آتی ہیں تو چراغاں کا عجب دلفریب منظر آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ اس سے منشاء یہ ہوتا ہے کہ ارواح اِن کشتیوں کے ذریعہ واپس آئیں۔

تجارت و حرفت

آج ساری دنیا کو حیرت ہے کہ جاپان اِتنی سستی اور اتنی عمدہ اشیاء کیونکر تیار کرتا ہے۔ تعجب بڑھتا اُس وقت ہے جبکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جاپانی اشیاء پر محصول حد سے سوا عائد کیا جاتا ہے اور باوجود اِس روک تھام کے جاپان ہی کا دل گردہ ہے کہ وہ ایسے نامساعد حالات کے تحت اِتنی سستی اشیاء بازار میں رکھتا ہے کہ بادی النظر میں یہ نظر آتا ہے کہ اِن داموں تو شئے تیار ہی نہ ہو سکیگی کجا یہ کہ منافع پر فروخت ہو۔

جاپان کی تجارتی و حرفتی ترقی دنیا کے سارے ملکوں خصوصاً ہندوستان کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔

دراصل اِس میدان کی کامیابی کا راز جاپان کے ذرائع حمل و نقل میں مضمر ہے۔ ۱۸۶۸ء میں جاپان بھر میں ریل گاڑی کا پتہ نہ تھا۔ ۱۸۷۲ء میں پہلی ریلوے لائن پڑی اور 'یوکوہاما' اور 'ٹوکیو' کے درمیان اٹھارہ میل تک محدود تھی۔ ۱۸۹۰ء تک ایک ہزار میل سے زیادہ ریلوے لائین کا جال بچھ گیا اور ۱۹۲۲ء میں سات ہزار میل تک نوبت پہنچی اور آج جاپان کا چپہ چپہ اس سے خالی نہیں۔

جہازرانی جاپان کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ آج جاپان کا بیڑا دنیا کے تیسرے درجہ پر شمار ہوتا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں سامان لے جانے کے لئے اُس کے ہاں صرف ۱/۱۰ حصہ جہازوں کا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں نصف حصہ اور اب اُس کے ہاں کی تجارتی جہازوں کی کمپنی اپنے ۴۹ بڑے بڑے جہازوں کی وجہ سے دنیا کی تجارتی کمپنیوں میں پیش پیش نظر آتی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے جہاز جاپان میں تیار ہوئے۔

ذرائع آمد و رفت اتنے وسیع ہیں اور اُن کا کرایہ اتنا سستا ہے کہ یہی دراصل تجارتی کامیابی کی کلید نظر آتی ہے بائیسکل۔ ٹرائیسکل۔ موٹر سائیکل۔ موٹر۔ موٹر لاریاں۔ ریل۔ ٹراموے اور ایسی قسم کی دوسری سواریاں اِتنی کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ جن کے بغیر لین دین میں سہولتیں بہم نہیں پہنچائی جاسکتیں۔ "کوبے" اور "اوساکا" جو ایک دوسرے سے بیس بائیس میل کے فاصلے پر ہیں اِن دونوں شہروں میں مسافروں کی آمد و رفت کے لئے گورنمنٹ

ریلوے ٹرین روزآنہ ڈیڑھ سو سے زیادہ مرتبہ آتی جاتی ہے
اس کے سوا دو برقی ٹرامو ئے کمپنیاں ہیں اور اُن کی تعداد
ریل سے کم نہیں۔ پھر سٹی ٹرامو ئے کمپنیاں اور موٹر بس کمپنی
کی گاڑیاں الگ ہیں۔

تار۔ خط۔ ٹیلیفون کے اخراجات بہ نسبت دوسرے
ممالک کے بہت سستے ہیں۔ پٹرول ۳۵ سین (دو سین
= ایک پیسہ) فی گیالن ملتا ہے۔ بجلی کی طاقت کارخانوں
کو حیرت انگیز حد تک سستی مہیا کی جاتی ہے یعنی ایک
کلو واٹ دو سین کو۔

۱۸۷۲ء تک سارے جاپان میں ایک بھی کارخانہ
نظر نہ آتا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں ۰۰۰ر۱۴ اور ۱۹۱۹ء تک ۱۸۳۱ر۴۸
کی تعداد ہو گئی تھی جہاں ۲۴۹۰۳۹۰ر۱ مزدور کام کرتے
تھے۔ آج بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ برطانیہ اور جرمنی
کے کارخانوں میں کوئی چیز ایسی نہیں بنتی جو جاپان کے
کارخانوں میں بنائی نہ جاسکے۔ البتہ فرق معیار کا ہوگا اور
وہ بھی محض اس لئے کہ اُن کے داموں میں اُس معیار
سے زیادہ فرق واقع ہوتا ہے پھر بھی خوبصورتی کے لحاظ
سے مشہور ہے کہ جاپان اپنی نقالی میں اصل کو مات
کر دیتا ہے۔ عام طور پر یہ جو خیال جڑ پکڑ چکا ہے کہ جاپان سوائے
نقل کے ایجاد کے میدان میں چاروں خانے چت نظر آتا ہے
اُس کے دُور کرنے کی فکر میں جاپانی حکومت اور کارخانے
اپنی پوری طاقت صرف کر رہے ہیں اور وہ دن دُور نہیں
جبکہ یہ الزام بھی اُٹھ جائے۔

کارخانے شہروں اور قصبوں دونوں جگہ افراط
سے دکھائی دیتے ہیں۔ کارخانوں کے علاوہ قصبے کی ہر دوکان
اور شہر کے مقامات میں ہر گھر مستقل طور پر ایک چھوٹا سا
کارخانہ ہوتا ہے۔ گھریلو صنعت کے یہ چھوٹے چھوٹے کارخانے
بالعموم رہائشی مکانوں کے ایک حصہ میں ہوتے ہیں۔ مکان
کے مالک کارخانے کے بھی مالک ہوتے ہیں اور یہی انجینیر
بھی کلرک بھی ایجنٹ بھی اور فورمین بھی ہوتے ہیں۔ یہاں
عام طور پر نا کتخدا لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ اِس قسم کے کارخانوں
کا کل خرچ بس دس پندرہ مزدور لڑکیوں کی اُجرت ہے
جو مشینوں پر کام کرتی ہیں۔ وہ خام اشیاء روزآنہ خرید لیتے
ہیں اور اُن سے مختلف چیزیں تیار کر کے شام تک
بیچ دیتے ہیں۔

ہر بڑے کارخانہ میں سُوت بٹنے اور کپڑا بننے
کا کام ساتھ ساتھ ہوتا ہے مگر کپڑے کو جلا دینے اور چھاپنے
کا کام علحدہ۔ تمام کارخانے عموماً رات دن چلتے رہتے ہیں

گھٹیا مال کو روکنے کی غرض سے حکومت نے
انسپکٹر مقرر کر رکھے ہیں جو ہر کارخانے میں پہنچکر اُن تمام
اشیاء کا معائنہ کرتے ہیں جو باہر بھیجی جارہی ہوں۔ اور جب
تک اِس قسم کی تنقیح نہ ہو جائے سامان باہر جا نہیں سکتا۔

تاریخ

تاریخ سے پہلے جاپان کے اصلی باشندوں اور
اُن کی تاریخ کے متعلق واقعات نہیں
ملتے۔ شاید اُس کا سبب یہ ہے کہ جاپانی بہت زیادہ قدیم
قوم نہیں اور نہ یہ ملک عہد عتیق میں گہوارۂ تمدن رہا۔ ایشیا
سے جہاں مختلف قبائل صحرا نوردی کے لئے نکلے اور
آس پاس کے ممالک میں پہنچے وہاں جاپان میں بھی جا
آباد ہوئے۔ ایک قدیم قوم جزیرہ "یے زو" میں اب بھی

پائی جاتی ہے اور شاید یہی وہ قدیم ترین قوم ہے جو برآعظم ایشیاء سے وارد ہوئی کیونکہ اس کی وضع قطع اور چہرہ کی ساخت وغیرہ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ایشیائی قوموں سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔

پہلا حکمران کہا جاتا ہے کہ جاپان کا پہلا حکمران "جمو" تھا۔ اُس کا زمانہ اندازاً پہلی صدی عیسوی کا بتایا جاتا ہے۔ اُس نے جاپان کے ایک بڑے حصہ پر اپنا تسلط جما کر اپنا دارالخلافہ اُسی مقام کو بنایا جو آج کل "اوساکا" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جاپان ہی کا قدیم باشندہ تھا یا باہر سے آیا لیکن قیاس بتاتا ہے کہ وہ جاپان سے تعلق نہ رکھتا تھا۔ بہر حال اُس نے اپنا جھنڈا بلند کر کے اپنے آپ کو "مقدس حکمران" منوالیا۔

بدھ مت کا اثر بدھ مت نے جس سُرعت کے ساتھ ہمسایہ ممالک پر اپنے اثرات جمائے اُس کی مثال ہندوستان کا کوئی اور مذہب نہیں پیش کر سکا۔ ایک طرف تو وہ ہندوستان سے باہر چین پہنچا اور دوسری طرف جاپان میں اپنے قدم جمائے۔ تاریخوں میں اختلاف ہے کہ آیا بدھ مت جس زمانہ میں چین پہنچا اُسی وقت جاپان میں بھی پھیلا یا بعد۔ لیکن زیادہ تر رواتیں اِس خیال کی تائید میں ملتی ہیں کہ اوائل چھٹی صدی عیسوی میں جاپان میں گوتم بدھ کی سیوا ہونے لگی۔ یہ زمانہ غالباً "سوگا" خاندان کی حکومت کا تھا۔

بدھ مت کے اخلاقی قوانین نے جاپانی زندگی پر رفتہ رفتہ اپنا تسلط جمانا شروع کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں تہذیب و معاشرت کی کایا ہی پلٹ دی۔ لیکن اِس انقلاب کے بعد بھی ملک میں ایک فرقہ ایسا باقی رہا جو نئے مذہب اور نئے اُصول معاشرت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ اختلافات کی خلیج اِتنی بڑھی کہ دو مکاتیب خیال ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہو گئے۔

نویں اور دسویں صدی عیسوی نویں اور دسویں صدی عیسوی میں جاپان نے چین کے اثرات قبول کرنے شروع کئے۔ چین اس وقت کافی متمدن اور ہر لحاظ سے جاپان کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ ہو سکتا تھا لیکن جاپان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اوّل تو تقلید میں جلدی نہیں کرتا اور دوسرے یہ کہ پوری طرح پیروی نہیں کرتا۔ اِس خصوصیت کے مدنظر جاپان نے چین کی ترقیوں کو دیکھکر چاہا کہ اُس کی پیروی کرے اور گو کہ بہت سی چیزوں میں اُس کے نقوش پر چلنے کی کوشش کی مگر بعض سیاسی تدابیر میں اپنی روایتی شش و پنج کا دخل رکھا مثلاً بدھ مت کے اثرات کو اتنا قبول کر لیا کہ سیاسی معاملات میں بھی مذہب ہی کا بول بالا رہا۔ خانقاہوں۔ معبدوں اور پوجاریوں کو ملک کی زمینات بلا معاوضہ اور بغیر کسی محصول اور لگان کے اِتنی عطا کی گئیں کہ عوام مفلس ہو کر رہ گئے۔ اور اُسی کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ حکومت کے بعد مذہب کا وقار ملک کے طول و عرض میں قائم ہو گیا بلکہ بعض معاملات میں تو مذہب کے آگے حکومت کی دال بھی گلتی نظر نہ آتی تھی۔ یہ مذہبی اقتدار ایک سے زیادہ مواقع پر ملک میں بُرے اثرات پھیلانے کا ذمہ دار قرار دیا جا چکا لیکن ایک دفعہ جال میں پھنسنے کے بعد رہائی ذرا مشکل ہی نظر آتی ہے!

قرون وسطیٰ مذہبی اِداروں کے قبضہ میں اِتنی زمینیں آگئیں کہ اُنہوں نے نہ صرف اپنے آپکو

مذہب کی حد تک محدود رکھا بلکہ ملک کے نظم ونسق میں بھی دخل دینا شروع کیا مگر جب انہیں حکومت سے برابر کا مقابلہ کرنا پڑا تو انھوں نے خیال کیا کہ مذہبی طاقت کے علاوہ دنیاوی قوت کی بھی ضرورت ہے اور اسی وجہ سے باضابطہ طریقہ پر فوج رکھنی شروع کی اور رفتہ رفتہ یہ طریقہ "جاگیرداری" قسم کے نظام میں منتقل ہوگیا۔ مذہب کے پیشوا اپنی زمینات اور افواج کے بل بوتہ پر زبردستی جاگیردار بن بیٹھے اور اپنے وسیع علاقہ کے مالک و مختار معاملہ یہیں تک نہیں رہا۔ بلکہ جب حکومت ان کے کاروبار میں حائل ہوئی تو انہوں نے حکومت کے خلاف جھنڈا بلند کیا۔ ظاہر تھا کہ شہنشاہیت کو شکست ہوئی اور یہ جاگیردار جو اب رئیس ہو چکے تھے صاحب اقتدار اور حکومت کے مالک ہو گئے۔ اس اقتدار کے بعد انھیں "شوگن" کہا گیا اور ان کے طرفداروں کو "شوگنیٹ"۔

انھوں نے بالکل ہی نئے طریقہ پر حکومت کرنے کی ٹھان لی۔ سب سے پہلے انہیں چونکہ اپنی حفاظت مقصود تھی اس لئے عوام کے دلوں پر اتنا رعب جمایا کہ وہ محض ان کے نام سے کانپ اٹھتے تھے۔ اس کے علاوہ اطاعت کا اتنا پروپیگنڈا کیا کہ بغاوت کے امکان ہی کو جہاں تک ممکن ہو سکا مٹا دیا۔

مگر اس کے باوجود بھی ایک عرصہ تک وہ اچھی حالت میں نہ رہ سکے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ بیرونی اثرات جاپان اور ان کے اقتدار کے لئے مضر ہیں۔ اور اسی خیال کی وجہ سے انھوں نے جاپان کو ایک چار دیواری کے اندر بند کر دیا۔

اٹھارویں اور انیسوی صدی عیسوی چین میں شہنشاہیت کا زور تھا اور اسکے اثرات جاپان پر پڑنے نہایت ضروری تھے لیکن چونکہ "شوگنیٹ" نے بیرونی اثرات کے قبول کرنے کے تمام راستے بند کر دئے تھے اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ چینی شاہ پرستی کا جذبہ علی الاعلان یہاں کارفرما ہوتا مگر پوشیدہ طور پر آہستہ آہستہ چینی خیالات عوام میں پھیلنے شروع ہوئے اور وہ جو طبقہ ایک عرصہ سے شاہ پرست تھا مگر زمانہ سازی کی وجہ سے خاموش تھا چپ چپ کر اس نئی تحریک میں دلچسپی لینے لگا۔

بالآخر ۱۸۶۷ء میں شہنشاہوں اور "شوگنیٹ" کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں اول الذکر فرقے کو اقتدار حاصل ہوگیا اور اس کے ساتھ شہنشاہیت جاپان میں دوبارہ لوٹ آئی۔ اسی مراجعت سے جدید جاپان کا آغاز ہوا۔

"میجی ایرا" یا دور جدید شاہ "میجی" نے تخت نشین ہوتے ہی قسم کھا کر جن دفعات کا اعلان کیا تھا وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ایک مجلس مشاورت کی تنظیم ہوگی جو امور سلطنت پر آزادانہ طور پر اپنی رائے کا اظہار کریگی۔

(۲) نظم ونسق کے معاملات میں رعایا کی تجویزوں اور تحریکوں کو کافی اہمیت دی جائیگی۔

(۳) رعایا کے واجبی خواہشات کی تکمیل کی جائیگی۔

(۴) ایسی رسوم جن سے ملک کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکتا ہو ترک کر دی جائینگی۔

(۵) علم کو خوب پھیلایا جائے گا۔

شاہ پرستی جاپان میں شاہ پرستی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اسکا اندازہ ۱۸۸۹ء کے آئین شاہی سے ہو سکیگا آئین کے باب اول میں سترہ دفعات ہیں اور وہ سب بادشاہ کی ذات سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے چند کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

(۱) سلطنت جاپان پر بادشاہ کی حکومت ہوگی اور یہ

اُس کا خاندانی حق ہے۔

(۲) بادشاہ کی ذات مقدس ہے۔

(۳) بادشاہ آئین و دستور کے مطابق حکومت کرتا ہے

اِن سب کا وہی مفہوم ہے جو برطانیہ کے تاج سے بھی متعلق ہے کہ "بادشاہ غلطی نہیں کر سکتا"۔ جاپانی بادشاہ کو خدا کی طرف سے بھیجا ہوا اُس کا نمائندہ خیال کرتے ہیں اور اسی سبب سے اُس کے افعال و حرکات پر کسی کو چوں و چرا کا حق حاصل نہیں۔

مگر آجکل سیاسیات کی بڑھتی ہوئی تعلیم نے جاپان کے بعض حلقوں میں ایک نیا خیال پیدا کر دیا ہے اور وہ یہ کہ آیا حکومت اور بادشاہ دو علیحدہ چیزیں ہیں یا ایک ہی بعض انقلاب پسند جو مغربی اثرات سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں لیکن جنکی تعداد بہت کم ہیں کہتے ہیں کہ بادشاہ اور حکومت دو علیحدہ چیزیں ہیں اور بادشاہ کا یہ فریضہ ہے کہ وہ حکومت کے منظور شدہ قوانین کو نافذ کرے۔ اُس کے برخلاف شہنشاہ پرستوں کی جماعت اُن کو غدار سمجھتی ہے اور مُصر ہے کہ بادشاہ اور حکومت دو علیحدہ چیزیں نہیں ہیں بلکہ بادشاہ کی ذات خود حکومت ہے اُس کا ہر قول اور ہر فعل حکومت کا ایک جزو ہے۔ اِس طرح آئین و دستور بادشاہ کے رجحانات اور خیالات کا مجموعہ ہیں۔

تعلیم

جاپان میں ہر شخص تھوڑا بہت لکھ پڑھ سکتا ہے۔ ابتدائی تعلیم لازمی اور مفت ہے اور انتظام نہایت اعلیٰ۔ ابتدائی مدارس کا نصاب چھ سال کا ہے۔ اِس کے بعد ثانوی تعلیم پانچ برس تک دیجاتی ہے۔ جامعات میں فیس زیادہ لیجاتی ہے لیکن اُن میں محض ادبیات ہی کی تعلیم نہیں ہوتی بلکہ فنون بھی سکھائے جاتے ہیں اور طلباء کسی

نہ کی ں یں ہ رت تامہ پیدا کر لیتے ہیں۔

ثانوی تعلیم کے بعد طلباء کے آگے دو راہیں کھُلی ہوتی ہیں۔ یا تو جامعی تعلیم حاصل کریں یا صنعتی۔ جامعی تعلیم کے لئے تین سال کا نصاب ختم کرنا پڑتا ہے اور صنعتی نصاب مختلف مدتوں میں تکمیل پاتا ہے۔

مدرسہ کا سال عموماً اپریل کے مہینہ سے شروع ہوتا ہے یہ موسم وہاں بہار کا ہوتا ہے۔ صبح آٹھ بجے سے اوقات مدرسہ شروع ہوتے ہیں اور کم از کم پانچ گھنٹے یا زیادہ سے زیادہ آٹھ گھنٹے تک تعلیم ہوتی ہے۔

جاپانی مدارس میں تین میقات مقرر ہیں۔ پہلی اپریل کے دوسرے ہفتہ سے جولائی کے پہلے ہفتہ تک۔ دوسری ستمبر کے دوسرے ہفتہ سے دسمبر کے تیسرے ہفتہ تک اور تیسری جنوری کے دوسرے ہفتہ سے مارچ کے پہلے ہفتہ تک اور ہر میقات کے آخر میں امتحان ہوتا ہے۔

گرمی کی چھٹیوں میں لڑکے عموماً تعلیمی تفریحوں پر نکل جاتے ہیں دوسری میقات کی چھٹیوں میں تمام مدارس کے لڑکے ایک ایک ہفتہ کے لئے فوجی تعلیم پاتے ہیں۔ یوں تو ثانوی تعلیم میں فوجی قواعد سکھائی جاتی ہے۔ لیکن اِن دنوں چھاؤنیوں میں باضابطہ فوجی زندگی بسر کرنے کا عملی طریقہ بتایا جاتا ہے۔ تیسری میقات کی چھٹیوں میں طلباء عام طور سالانہ امتحان کی تیاریوں میں مصروف رہتے ہیں۔

تعلیم نسواں

جاپان میں موجودہ تعلیم کا دور ۱۸۷۲ء سے شروع ہوا جبکہ ابتدائی تعلیم جبری قرار دیگئی ابتدا میں مغربی تقلید کا زور تھا اور جو لڑکیاں مدرسوں سے نکلتی تھیں وہ اُمور خانہ داری سے نابلد ہوتی تھیں اور محض فیشن کی پرستار۔ لیکن بہت جلد جاپانیوں نے

اُس کو محسوس کر لیا اور رفتہ رفتہ لڑکیوں کے نصاب میں اُمورِ خانہ داری کو شامل کر کے اُنہیں اچھی مائیں بننے پر زور دیا گیا۔

۱۸۸۶ء میں ملک میں ایک جماعت ایسی پیدا ہوئی جنھوں نے عورتوں کے نصاب میں ضروری ترمیم کا بیڑا اُٹھایا اِس جماعت میں عورتیں اور مرد دونوں پہلو بہ پہلو شامل تھے اُس کی متحدہ کوششوں نے ایک نئے درسگاہ کی بنیاد ڈالی جس میں دستکاری اور اُمورِ خانہ داری لازمی اجزاء قرار دیئے گئے اُس کا نام "جوشی شوکوگنوگکو" ہے۔ ۱۹۲۵ء میں اُس کے نصاب میں ضروری ترمیم کی گئی اور ۱۹۲۹ء میں یہ بامِ عروج پر پہنچ گیا اِس وقت اُس میں تین شعبے قائم ہیں:۔

(۱) شعبہ دست کاری۔ اِس میں فوقانیہ مدارس کی سند یافتہ لڑکیاں داخل ہو سکتی ہیں۔ اِس کا نصاب تین سال کا ہے۔

(۲) شعبہ اُمورِ خانہ داری۔ اِس میں بھی فوقانیہ مدارس کی سند یافتہ لڑکیاں شریک ہو سکتی ہیں لیکن نصاب دو سال کا ہے۔

(۳) شعبہ دست کاری ادنیٰ۔ اِس میں ابتدائی مدارس کی سند یافتہ لڑکیاں داخل ہو سکتی ہیں اور نصاب چار سال کا ہے۔

اِس درسگاہ کی کامیابی اور ہر دل عزیزی کا اندازہ طالبات کی روز افزوں تعداد سے ہو سکتا ہے پچھلے سال شعبہ اوّل میں ۶۵۰ طالبات تھیں اور دوسرے شعبہ میں ۱۰۰۰ اور تیسرے شعبہ میں ۸۳۰ لڑکیاں۔

مُوگا یعنی نئے فیشن کی لڑکی جاپان کی لڑکیاں بڑی سرعت کے ساتھ مغرب زدہ ہو رہی ہیں۔ سب سے پہلے اُنھوں نے جاپانی لباس اُتار پھینکا۔

ابتدا میں عورتوں نے یہ محسوس کیا کہ اُن کا ملکی لباس "کیمونو" بہت گراں ہے کیونکہ اُس پر اوّل تو کپڑا بہت صرف ہوتا ہے اور دوسرے اُس کی سلائی کی اُجرت بھی زیادہ ہے۔ اِسی خیال سے اُنھوں نے چُست یوروپین لباس زیب تن کیا جس میں اُنہیں کافی کفایت ہونے لگی۔ لیکن لباس کے ساتھ ہی ساتھ حُسن کی زیبائش کے سارے مغربی اشیاء کا اِستعمال بھی ضروری ہو گیا۔ ہونٹوں اور گالوں پر لالی۔ غازہ اور دوسری آرائشی اشیاء جزوِ زندگی ہو گئیں

اِس کے علاوہ جاپانی لڑکیوں نے امریکی فلم ایکٹرسوں کی تقلید شروع کر دی۔ ہر لڑکی کسی نہ کسی ایکٹرس کو پسند کرنے لگی اتنی کہ چہرہ کی آرائش۔ لباس کی قطع و بُرید۔ بات کرنے کا لب و لہجہ اور چال ڈھال تک میں اُس کی تتبع کو فیشن سمجھنے لگی۔

جہاں مغرب پرستی کے بُرے نتائج ظاہر ہوئے وہاں بیشمار فائدے بھی اُنہیں حاصل ہوئے۔ مثلاً "کیمونو" ترک کرنے کی وجہ اُن کی صحت پر بڑا اچھا اثر ہوا۔ لمبے اور ڈھیلے "کیمونو" میں اُن کے اعضاء اچھی طرح حرکت نہیں کر سکتے تھے جس کی وجہ سے اُن کے جسم کے اکثر حصے نشو و نما سے یکسر قاصر تھے۔ لیکن مغربی چست اور چھوٹے لباس میں اُن کے تمام اعضاء کو ایک گونہ آزادی حاصل تھی جس کی بدولت اُن میں قوت اور نمو بڑھ گئی۔ چنانچہ قد میں کافی اضافہ ہوا۔ چودہ برس سے اُنیس برس کی لڑکیوں کے قد میں گذشتہ صدی کے مقابلہ میں انچ سواء انچ کا اضافہ ہوا۔

نوجوان لڑکیاں اب برابر کھیل کود کے میدان میں کودتی پھاندتی نظر آتی ہیں۔ ورزش اور تیراکی میں اُنھوں نے

زیادہ دلچسپی لی اور اس کے علاوہ بین الاقوامی کھیلوں میں جاپانی عورتیں اب برابر مقابلہ کر رہی ہیں۔

شادی شادی کرنا جاپانی کا ذاتی فرض نہیں بلکہ خاندانی فرض ہے اور اسی لئے شادی کا انتظام اس کے خاندان کے ذمہ ہوتا ہے۔

بڑا لڑکا خاندان کا چشم و چراغ سمجھا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ہی ساتھ اس پر بعض خاندانی حقوق بھی ہوتے ہیں جن کو کسی حال میں وہ ٹال نہیں سکتا۔ مثلاً یہ کہ اس کا فریضہ ہے کہ وہ ماں باپ ہی کے گھر میں رہے شادی کرنے سے پہلے اور شادی کے بعد۔ وہ کبھی علیحدہ گھر میں نہیں رہ سکتا۔ ماں باپ کی اطاعت اور اُن کی پرورش اُس کے ذمہ ہوتی ہے گو کہ دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں پر بھی یکساں حق ہوتا ہے۔

لڑکا ہو یا لڑکی اُن کے لئے شریک حیات تلاش کرنا ماں باپ کا فریضہ ہے گو فیصلہ اور پسند کا حق باپ کو زیادہ ہوتا ہے۔ وہ جس کو پسند کرتا ہے اُس سے شادی ہوگی۔ ماں یا اور کوئی عزیز اس کو رد نہیں کر سکتا۔ طریقہ یہ ہے کہ دولہا یا دلہن کی تلاش ایک شادی شدہ اور با اعتماد دوست کے سپرد ہوتی ہے اور وہ "مشاطہ" کا کام کرتا ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ دوست اپنی جان پہچان ہی میں انتخاب کرتا ہے اور شادی کے وقت اُس کی حیثیت سمدھی کے برابر ہوتی ہے۔ اُس کو جاپانی "نکودو" کہتے ہیں۔ اُسکا فرض شادی کے بعد ختم نہیں ہو جاتا بلکہ عمر بھر ساتھ رہتا ہے اگر میاں بیوی میں کسی قسم کی رنجش ہو جائے تو وہی بیچ بچاؤ کرتا ہے اور دونوں طرف کہہ سن کر باہمی سمجھوتہ کروا دیتا ہے اور طلاق کی نوبت نہیں آنے دیتا۔

شریک حیات کے انتخاب میں اوّل خاندان کا لحاظ رکھا جاتا ہے پھر یہ دیکھا جاتا ہے کہ کوئی خاندانی مرض تو نہیں۔ برص بڑا موذی مرض سمجھا جاتا ہے اور جس کسی خاندان میں یہ مرض ہو وہاں شادی بڑی مشکل سے ہوتی ہے۔ چاہے وہ کتنے ہی حسین کیوں نہ ہوں مگر انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔ اشتہار بازی کا سلسلہ عام ہے۔ اس کے علاوہ بعض ایجنسیاں بھی قائم ہیں جو شادی کرنے کا ذمہ لیتی ہیں۔ مگر چونکہ اس طریقہ پر بعض دفعہ دھوکہ ہوتا ہے اس لئے پولیس ایسی ایجنسیوں کی خاطر خواہ نگرانی کرتی ہے اور حال ہی میں مزید سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے میونسپلٹیوں نے شادی کی ایجنسیاں قائم کر رکھی ہیں۔

حسب و نسب کے بعد دونوں خاندانوں کا ہم رتبہ و ہم پلہ ہونا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ لڑکی یا لڑکے کی ذاتی خوبیوں کو ٹٹولا جاتا ہے۔ ہر دلعزیزی ذہانت اور صحت اُن کے لئے سب سے زیادہ ضروری صفات ہیں اس کے سوا لڑکے کی موجودہ آمدنی اور آئندہ کے توقعات کا بھی اندازہ لگایا جاتا ہے۔

جب شریک کا انتخاب ہو چکتا ہے تو ماں باپ لڑکی اور لڑکے کو ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع دیتے ہیں اور یہ اکثر سینما اور تھیٹر میں ہوتا ہے۔ اس رسم کو "میائی" کہتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں اس کا وجود ہی نہ تھا۔ لیکن روشن خیالی کے ساتھ ساتھ اس کا ظہور ہوا اسلئے لڑکی اور لڑکے کو انتخاب کا موقع دیتے ہیں۔

منگنی کے بعد دلہن والے جہیز تیار کرتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں جہیز بہت دیا جاتا تھا لیکن اب بہت کمی ہوگئی ہے۔ "کیمونو" کے چند جوڑوں کے علاوہ نقد رقم

عموماً دی جاتی ہے کہ لڑکی اپنے گھر کی ضرورتوں کے لحاظ سے سامان خرید لے۔

پہلے زمانہ میں نکاح دُولھا کے گھر میں ہوتا تھا یا کبھی کبھی کسی مذہبی مقام پر۔ لیکن آجکل گھر میں یہ رسم کم ہوتی ہے اور ہوٹلوں میں یا کسی خاص مقام پر زیادہ۔ دُولہا دُولہن اپنے قومی لباس میں ہوتے ہیں لیکن برات میں کوئی شامل نہیں ہوتا۔ سوائے ”نکودو“ اور اُس کی بیوی کے۔ نکاح خوانی کی رسم عموماً ایک ناکتخدا لڑکی ادا کرتی ہے اور کبھی کبھی اُس کے ساتھ اُس کا ہم عمر ایک لڑکا بھی ہوتا ہے جو اکثر شراب پلانے کا کام انجام دیتا ہے۔ اِس موقع پر جو شراب پلائی جاتی ہے اُس میں نشہ بہت ہی کم ہوتا ہے۔ دُولہا دُولہن کو اور دُولہن دُولہا کو شراب پلاتی ہے۔

نکاح کے بعد دُولہن سُسرال چلی جاتی ہے جہاں اُسکے تعارف کے لئے ایک ضیافت ترتیب دی جاتی ہے۔ پھر شادی کی رجسٹری کرائی جاتی ہے اور لڑکی کا نام اُس کے خاندان سے کاٹ کر لڑکے کے خاندان میں شامل کر لیا جاتا ہے۔

جاپانی قانون میں شادی کی عمر لڑکی کے لئے کم از کم پندرہ سال اور لڑکے کے لئے کم از کم سترہ سال ہے۔

معیار زندگی

معیار زندگی کا اندازہ لگانے کے پہلے جاپانی سکہ کی قیمت معلوم کرنی ضروری ہے۔ پہلے سونے کا سکہ بھی رائج تھا لیکن کساد بازاری کی وجہ سے اب یہ سکہ متروک ہو گیا۔ ”ین“ کے نام سے جو سکہ رائج ہے وہ ہندوستان کے تیرہ آنہ کے تقریباً مساوی ہے اِس ”ین“ کے ایکسو ”سین“ ہوتے ہیں گویا کہ ایک پیسہ دو ”سین“ کے برابر ہوتا ہے۔

زرعی مزدوروں کی اُجرت

زرعی مزدوروں کی اوسط روزآنہ اُجرت تقریباً پچاس ”سین“ ہے عورت کی مزدوری تیس ”سین“ ہے اور بچوں کی نصف۔ یہ اُجرت اُن مزدوروں کی ہے جو سال بھر کا ٹھیکہ لیتے ہیں۔ ایک کاشتکار کا خاندان عموماً پانچ یا چھ افراد پر مشتمل ہوتا ہے جس کی اوسط مجموعی آمدنی ایک ہزار ”ین“ سالانہ ہوتی ہے اور یہ رقم اُس سارے خاندان کو آسودہ حال رکھ سکتی ہے لیکن بدقسمتی سے جاپانی کسان بہت مقروض ہوتے ہیں اسی لئے یہ آمدنی اُنہیں کافی نہیں ہوتی۔

صنعتی مزدوری

صنعت وحرفت کے کارخانوں میں مرد اور عورت دونوں دوش بدوش کام کرتے ہیں اور اوس طبقہ کی آمدنی کا اوسط زراعت پیشہ طبقہ سے بڑھا ہوا ہے۔ یہاں مَردوں سے زیادہ عورتیں نظر آتی ہیں۔ اِن میں سولہ سال سے کم عمر کے بچے بھی شامل ہیں۔ پارچہ بافی کی صنعت میں سوا سات لاکھ کے قریب عورتیں کام کرتی ہیں اور اسی لئے اس مخصوص شعبہ میں اُن کی اکثریت ۸۲ فیصد ہے۔ اور مزدوری کا اوسط ۵۷ ”سین“ ہے برخلاف اِس کے مَرد کا اوسط ایک ”ین“ پچاس ”سین“ ہے۔

مکان

معمولی کرایہ کا مکان جس میں اوسط طبقہ کے لوگ رہتے ہیں جاپانیوں کی ضرورت کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اس میں چار کمرے ہوتے ہیں اور یہ دو اور تین گز کے درمیان عریض وطویل ہونگے۔ اِن کے علاوہ باورچیخانہ۔ بیت الخلاء اور کوئلہ رکھنے کی جگہ ضرور ہو گی۔ سامان رکھنے کے لئے ہر کمرے میں الماری نما کوٹھڑی

ہوتی ہے۔ اگر مکان بازار سے دُور ہے تو اُس میں غسل خانہ بھی ہوگا ورنہ ہر محلہ میں پبلک حمام موجود ہیں۔ مکان دو منزلہ ہوگا اور اُس کے چاروں طرف باغیچہ خواہ وہ چار فٹ مربع ہی کیوں نہو ضرور ہوتا ہے۔

خوراک جاپانیوں کا کھانے کا صرفہ بہت کم ہے۔ سو "ین" ماہوار [illegible] افراد پر مشتمل ہے صرف ۳۶ "ین" خوراک پر خرچ کرتا ہے۔ خرچ کم اس لئے ہوتا ہے کہ یہ گوشت نہیں کھاتے۔ دودھ بھی نہیں پیتے۔ بس صبح و شام چاول ہی چاول کھاتے ہیں۔ خشک مچھلی کا شوربہ اور ترکاریاں چاول کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ مچھلی بہت سستی ہے اس لئے اُس کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔ بھون کر کھاتے ہیں اور شوربہ بھی پکاتے ہیں مگر تلتے کم ہیں۔ سیپی کا شوربہ شوق سے پیتے ہیں جن کے مکان سمندر سے قریب ہیں اُن کی عورتیں عام طور پر ساحل سے خود سیپیاں کھود کھود کر لاتی ہیں۔

لیکن مغربی تہذیب کے ساتھ مغربی طرز کے کھانے بھی رفتہ رفتہ رائج ہو رہے ہیں اور نوجوانوں کا فیشن پرست طبقہ انڈا، گوشت اور دودھ استعمال کرنے لگا ہے۔

لباس جاپانیوں کو چونکہ اپنے مشرقی طرز کے لباس کے علاوہ مغربی وضع کی پوشاکیں بھی رکھنی ضروری ہیں اس لئے کپڑوں پر اُن کے اخراجات زیادہ ہوتے ہیں ہر ہر موسم کے لئے علٰحدہ علٰحدہ فیشن کے کپڑے سلوائے جاتے ہیں۔ ریشمی "کیمونو" کا پورا سوٹ تقریباً پچاس "ین" کا ہوتا ہے۔ اس میں تین کپڑے ہوتے ہیں۔ ایک سیاہ "کیمونو" دوسرا سیاہ "ہادری" یعنی "کیمونو" کے اُوپر پہنے کا چغہ جس پر خاندانی نشان ہوتا ہے اور تیسرا "ہکامہ" یعنی سایہ۔ یہ جاپانیوں کا قومی لباس ہے اور وہ اُسے پہنکر ہر تقریب میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اُس کو بالعموم گھر پر عورتیں ہی سی لیتی ہیں اور اگر درزی کے ہاں سلوایا جائے تو سوا "ین" اُجرت ہوتی ہے۔ عورتوں کا لباس نسبتاً مہنگا ہے "کیمونو" کی کاٹ تو ہمیشہ یکساں رہتی ہے مگر کپڑے پر بیل بُوٹے کی وضع اور رنگ عمر کے ساتھ ساتھ بدلتا جاتا ہے۔ چھوٹی لڑکیاں ایسے رنگ برنگ کے پھولدار "کیمونو" پہنتی ہیں کہ تتلیاں معلوم ہوں۔ نوجوان لڑکیاں شوخ رنگ پسند کرتی ہیں مگر شادی کے بعد اُن کی شوخی میں کمی ہونی ضروری ہے اور پچاس برس کے بعد عام طور پر عورتیں سیاہ کپڑے پہنتی ہیں۔

اخبار بینی کا ذوق جاپان میں جتنے لوگ اخبار پڑھتے ہیں اتنے دنیا کے کم مقامات پر پڑھتے ہونگے۔ اخبار بہت سستے بھی ہیں۔ اچھے سے اچھا اخبار ایک "ین" ماہوار میں صبح و شام گھر پر پہنچا دیا جاتا ہے ۵۰ "سین" میں ۳۵۰ صفحے کا مصوّر رسالہ ملجاتا ہے۔

جاپان کا سب سے بڑا اخبار "توکیو اساہی" ہے یہ ۱۸۸۸ء میں جاری ہوا تھا۔ اس اخبار کو شائع کرنے والی کمپنی کا نام "کابوشکی کیشا اساہی شمبون شا" ہے یہی کمپنی دوسرا اخبار "اوساکہ اساہی" بھی شہر اوساکا سے شائع کرتی ہے۔ اس طرح مشرق و مغرب دونوں سمتوں میں اس کمپنی نے اپنے اخبار پھیلا رکھے ہیں "توکیو اساہی" کی اشاعت گیارہ لاکھ روزانہ کے لگ بھگ ہے۔ اِس تعداد میں صرف ایک اِشاعت شامل ہے۔ خاص توکیو میں اس کی دو اشاعتیں ہیں اور اگر اسکو بھی شامل کرلیا جائے تو تعداد بیس لاکھ کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ ۲۱ × ½۱۵ انچ کے آٹھ صفحوں پر مصوّر شائع ہوتا ہے، اور صبح و شام دونوں اشاعتوں کی قیمت صرف ایک "ین" ماہوار ہے۔

شاہزادہ خرم اور ابابیل

آسکر وائلڈ (۱۸۵۶ ـ ـ ۱۹۰۰ء) آئرستانی انشاء پرداز اور مشہور ڈرامہ نگار نے آکسفورڈ میں تعلیم پائی اور وہاں کی فضاء سے متاثر ہوکر جمالیاتی ذوق کی نشو و نما کی۔ اسے اپنے طرز بیان اور اسلوب کی وجہ ایک نمایاں رتبہ حاصل ہے۔ اس کا طنز انگریزی ادب میں ایک خاص چیز ہے۔ چنانچہ یہ افسانہ (Happy Prince) اس کی طرز تحریر کا آئینہ دار ہے۔ اِس کا ترجمہ نگار کے ایڈیٹر ملک کے مشہور اور صاحب طرز اِنشاء پرداز نیاز فتحپوری کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔

شہر کے سب سے بلند حصّہ میں ایک بلند مینار پر شاہزادہُ خرم کا بُت نصب تھا۔ اِس مجسمہ پر سر سے پاؤں تک سونے کے پتّر چڑھے ہوئے تھے، آنکھوں کی جگہ چمکدار نیلم جڑے تھے۔ اور ایک بڑا لعل اُس کے تلوار کے قبضہ پر چمک رہا تھا۔ اِس میں شک نہیں کہ لوگ اِس بُت کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ایوان بلدیہ کے ایک رُکن نے جس کی بڑی خواہش یہ تھی کہ لوگ اُس کے ذوقِ سلیم کی داد دیں ایک روز اُس بُت کو دیکھ کر کہا کہ: "یہ بت ایسا خوبصورت ہے، جیسے مرغِ بادنما" اور پھر اس اندیشہ سے کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ غیر عملی آدمی ہے حالانکہ درحقیقت وہ ایسا نہ تھا، اس نے اپنے ایراد میں اسقدر اضافہ اور کر دیا کہ "فرق صرف اِتنا ہے کہ وہ کار آمد چیز ہے اور یہ بیکار۔"

اِسی طرح ایک روز ایک چھوٹے بچہ سے جبکہ وہ چاند کیلئے بیقرار تھا اس کی ماں نے کہا کہ "تم ایسے کیوں نہیں ہو جاتے جیسا شاہزادہُ خرم ہے دیکھو اس کے دل میں کسی چیز کے لئے ضد کرنے اور رونے کا خیال تک نہیں آتا۔"

اسی طرح ایک روز کوئی دل شکستہ اور مایوس آدمی اس حیرت انگیز بت کی طرف دیکھ رہا تھا تو اس کی زبان سے نکلا "کتنی خوشی کی بات ہے کہ دنیا میں کوئی ایک تو ایسا ہے جو واقعی مسرور و شادکام ہے"۔

ایک روز خیرات خانہ کے بچے صاف ستھرے سفید کرتے اور سرخ کوٹ پہنے گرجا سے نکلے تو انھوں نے بھی شاہزادہ کے بت کو دیکھ کر کہا کہ "شاہزادہ تو بالکل فرشتہ معلوم ہوتا ہے"۔

ریاضی کے استاد نے دریافت کیا کہ "جب تم لوگوں نے کوئی فرشتہ دیکھا ہی نہیں تو پھر تمہیں کیا معلوم کہ فرشتہ کیسا ہوتا ہے"۔ اس کا جواب بچوں نے یہ دیا کہ "دیکھا کیوں نہیں، ہم نے بارہا خواب میں دیکھا ہے"۔

ماہر ریاضیات برہم ہو کر بچوں کو گھورنے لگا کیونکہ وہ اسے پسند نہیں کرتا تھا کہ بچے خواب دیکھا کریں۔

ایک رات کو شہر کے اوپر ہی اوپر ایک ننھی سے ابابیل اڑی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ کی ابابیلیں سب کی سب چھ ہفتہ پیشتر مصر جا چکی تھیں اور یہ پیچھے رہ گئی تھی کیونکہ اسے ایک نہایت خوبصورت نے (نرکل) کے درخت سے محبت ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے ابابیل نے اس حسین درخت کو اس وقت دیکھا تھا جب ایک دن زرد رنگ کی تیتری کے تعاقب میں وہ دریا پر اڑی جا رہی تھی۔ خوبصورت درخت کا چھیلا پن اس ابابیل کو ایسا بھلا معلوم ہوا کہ وہ اس سے باتیں کرنے کے لئے ٹھہر گئی۔

ابابیل نے جو فوراً مطلب کی بات شروع کر دیا کرتی تھی اس سے پوچھا کہ "کیا میں تم سے محبت کروں"؟ اور اس نے بھی ادا کے ساتھ خم ہو کر کہہ دیا کہ "کیوں نہیں"۔

پھر کیا تھا ابابیل، عاشق زار ابابیل، اس کا طواف کرنے لگی وہ اڑتی ہوئی سطح آب کو اپنے پروں سے مس کرتی اور چھوٹی چھوٹی نقرئی لہریں اٹھاتی رہتی۔ یہ گویا اس کا اظہار محبت تھا، جو گرمیوں بھر اسی طرح جاری رہا۔

یہ دیکھ کر اور ابابیلیں آپس میں کہنے لگیں "عجیب مضحکہ انگیز عشق ہے۔ اس کے پاس دولت بھی نہیں اور رشتہ دار بھی اس کے بہت ہیں اور واقعی دریا نرکلوں سے بھرا ہوا تھا۔ الغرض جب فصل خزاں آئی تو تمام ابابیلیں چلدیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد وہ عاشق مزاج ابابیل تنہائی سے بہت گھبرائی اور اپنے محبوب سے بھی اکتا گئی وہ اپنے دل میں کہتی کہ "یہ بات تو کرتا ہی نہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ یہ عشوہ باز اور کرشمہ ساز بھی ہے۔ کیونکہ ہمیشہ ہوا سے اس کی چھیڑ چھاڑ جاری رہتی ہے"۔ اور یہ واقعہ تھا کہ جب ہوا چلتی تو نے نہایت خوبصورتی اور لچک کے ساتھ اس کے سامنے جھک جھک جاتا۔ پھر ابابیل کہنے لگی "میں جانتی ہوں کہ وہ گھر میں رہنا پسند کرتا ہے اور میں ٹھیری سیر و سیاحت کی دلدادہ، اس لئے میرا اس کا کیا ساتھ"۔ بالآخر ابابیل نے اپنے محبوب نے سے پوچھا "کیا تمہارا میرا ساتھ ہو سکتا ہے"۔

لیکن اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ فقط سر ہلا دیا اسے اپنے گھر سے بہت محبت تھی۔ یہ دیکھ کر ابابیل نے کہا "اچھا تو معلوم ہوا تم اب تک مجھے چٹکیوں ہی میں اڑاتے رہے ہو بہتر ہے میں بھی اب اہرام مصری کی طرف چلی"۔ ابابیل بیچاری دن بھر ماری ماری پھری اور شام کے وقت شہر میں پہونچی۔ رات ہو گئی تھی۔ سوچنے لگی۔ "کہاں ٹھہروں"؟ اس وقت اس کی

نظر شہزادۂ خرم کے بُت پر پڑی جو بلند مینار پر نصب تھا بُت کو
دیکھتے ہی وہ کہنے لگی "بس میں یہیں ٹھہروں گی جگہ بھی اچھی
ہے اور تازہ ہوا بھی یہاں کافی ہے۔" اِس لئے اُڑ کر شہزادہ
خرم کے دونوں پاؤں کے بیچ میں بیٹھ گئی۔

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور دیکھ کر دل میں کہنے لگی
"میں بھی کس قدر خوش نصیب ہوں۔ آرام کی جگہ بھی بالکل
زرنگار ملی۔" اِس کے بعد وہ سونے کی تیاری کرنے لگی لیکن
جونہی وہ اپنا سر پروں میں چھپانے لگی، اُس پر پانی کا ایک
بڑا قطرہ ٹپکا۔ وہ گھبرا کر چونک اُٹھی اور کہنے لگی "یہ تو عجیب
بات ہے۔ آسمان صاف ہے۔ بادل کا پتہ نہیں ستارے
جگمگا رہے ہیں لیکن بارش پھر بھی ہو رہی ہے۔ واقعی
شمالی یورپ کی آب وہوا نہایت عجیب ہے۔" اِس کے
بعد دوسرا قطرہ ٹپکا۔ ابابیل نے کہا۔

"یہاں سے چلنا چاہیئے اور کسی مکان کا اچھا سا
روشندان ڈھونڈھنا چاہیئے۔ ایسے بُت سے کیا فائدہ
جو پانی بھی نہ روک سکے۔"

یہ کہکر ابابیل وہاں سے اُڑنے کو تیار ہوئی اور جونہی
اُس نے اُڑنے کے لئے پر تولے، تیسرا قطرہ ٹپکا۔ اب جو
ابابیل نے گھبرا کر اُوپر کی طرف سر اُٹھایا تو دیکھا کہ شہزادہ خرم
کی آنکھیں اشک آلودہ ہیں اور اُس کے سنہرے رخسار پر
آنسوؤں کے قطرے بہہ رہے ہیں۔ شہزادہ کا چہرہ چاندنی
میں اِس قدر خوبصورت معلوم ہوتا تھا کہ ابابیل کا دل بھی
ہمدردی سے بھر آیا۔ اُس نے بُت سے دریافت کیا۔

.... "آپ کون ہیں؟"

بُت۔ "میں شہزادۂ خرم ہوں۔"

ابابیل۔ "پھر آپ رو کیوں رہے ہیں۔ آپ نے
تو مجھے بالکل تر بتر کر دیا۔"

بت۔ "جب میں زندہ تھا اور میرے پہلو میں انسانی
دل تھا۔ تو میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ آنسو کس چیز کا نام ہے۔
کیونکہ میں اپنے قصر میں رہا کرتا تھا جہاں رنج وغم کا پتہ نہ تھا
دن بھر میں باغ کے اندر اپنے احباب کے ساتھ کھیلتا
تھا اور رات کو بڑے ایوان میں بزم رقص وسرود میں
شریک ہوتا تھا، باغ کے گرد بڑی اُونچی دیوار تھی، لیکن
مجھے کبھی تمنا نہ ہوئی کہ کسی سے دریافت کروں، باہر
کیا ہے میرے گرد وپیش ہر چیز دلکش اور خوبصورت
تھی میرے مصاحب اور درباری مجھے شہزادۂ خرم
کہا کرتے تھے۔ اور درحقیقت میں تھا بھی ایسا ہی
بشرطیکہ عیش وطرب کے معنی خُرمی کے ہوں الغرض
میری تمام زندگی یونہی گزری اور اسی حال میں مَر گیا،
اب مَرنے کے بعد لوگوں نے میرا بُت یہاں اِس قدر
بلند نصب کر دیا کہ میں اپنے شہر کی تمام برائیاں اور تمام
مصائب خود اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں اور ہر چند
میرا دل سیسہ کا بنا ہوا ہے لیکن پھر بھی آنسو بہائے
بغیر نہیں رہ سکتا۔"

ابابیل۔ (دل میں) "ہائیں! کیا یہ بُت ٹھوس
سونے کا نہیں ہے؟"

یہ بات ابابیل نے دل میں اِس لئے کہی کہ وہ نہایت
مہذب اور با اخلاق چڑیا تھی۔ وہ ہرگز پسند نہیں کرتی تھی
کہ کسی کے ذاتیات پر حملہ کرے۔

بُت نے نرم لہجہ میں کہا:۔

"یہاں سے دور تنگ کوچہ میں ایک گھر ہے، اس
کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی ہے اور میں ایک عورت کو

میز کے سامنے بیٹھا دیکھ رہا ہوں۔ اس کا چہرہ لاغر و زرد ہے اس کے ہاتھ سوئیوں کی نوکیں چبھنے سے سرخ اور کھر درے ہو گئے ہیں کیونکہ وہ سلائی کا کام کرتی ہے۔ اسوقت وہ ملکہ کی ایک خوبصورت سہیلی کے لئے ساٹن کے لباس پر خوبصورت پھول کاڑھ رہی ہے۔ جسے وہ آیندہ بزم رقص میں پہنے گی۔ کمرہ کے ایک گوشہ میں پلنگ پر اس کا چھوٹا سا بچہ بیمار پڑا ہے۔ بچہ بخار میں مبتلا ہے اور سنتروں کے لئے ضد کر رہا ہے۔ ماں بیچاری کے پاس کیا دھرا ہے جو اپنے بچے کو دے۔ اسی لئے بچہ رو رہا ہے۔ ابابیل! اے میری ننھی ابابیل!! کیا تم ایسا نہیں کر سکتیں کہ میری تلوار کے قبضہ میں جو لعل جڑا ہوا ہے وہ نکالکر اس غریب عورت کو دے آؤ۔ میرے پاؤں تو اس کرسی میں جڑے ہوئے ہیں اور میں حرکت نہیں کر سکتا۔"

ابابیل:۔ "میرا تو مصر میں انتظار ہو رہا ہوگا۔ میرے دوست دریائے نیل کے اوپر خوش خوش اڑ رہے ہوں گے اور گلہائے نیلوفر سے باتیں ہو رہی ہونگی وہ رات کو فرعون کے مقبرہ میں جا سوئینگے۔ جو اپنے رنگین اور منقش تابوت میں پڑا سو رہا ہے۔ بادشاہ کی لاش زرد کتان میں ملفوف ہے اور مسالوں میں بسی ہوئی پڑی ہے۔ اس کے گلے میں ہلکے سبز رنگ کے بیش قیمت جواہرات کا ہار ہے۔ اور اس کے ہاتھ ایسے خشک ہیں جیسے برگہائے خزاں دیدہ"

بت:۔ "کیا واقعی تم میرے پاس رات بھر بھی نہ ٹھہروگی اور میرا یہ کام نہ کر دوگی؟ دیکھو پیاس کے مارے بچہ کی زبان منھ سے باہر نکلی پڑتی ہے اور اس کی ماں کسقدر ملول ہے"

ابابیل:۔ "معاف کیجئے میں لڑکوں کو ہرگز پسند نہیں کرتی پارسال گرمی میں جب میں دریا پر ٹھہری ہوئی تھی تو چکی والے کے بیہودہ لڑکے ہمیشہ میری طرف ڈھیلے پھینکا کرتے تھے۔ کوئی پتھر میرے لگا تو نہیں کیونکہ ہم ابابیل بہت تیز پرواز ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں میں اس خاندان کی ہوں جو اپنی تیز پروازی میں ہمیشہ مشہور رہا ہے۔ لیکن بہر حال اس طرح ڈھیلے پھینکنا توہین تو ہے"

یہ سنکر شہزادہ خرم بہت رنجیدہ ہوا۔ اس قدر رنجیدہ کہ ابابیل بھی بہت متاثر ہوئی اور آخر کار اسے کہنا پڑا کہ "اچھا میں ایک رات آپ کے پاس قیام کر لوں گی"

بت۔ شکریہ!

پس ابابیل نے شاہزادہ کی تلوار کے قبضہ سے وہ لعل نکالا اور چونچ میں لیکر مکانوں کی چھتوں پر اڑتی ہوئی

آسکر وائلڈ

نیاز فتح پوری

"یہ عجیب بات ہے کہ باوجودیکہ سردی پڑ رہی ہے لیکن مجھے گرمی محسوس ہو رہی ہے"

بُت :۔ "اس لئے کہ تم ایک نیک کام کرکے آئی ہو"
اس کے بعد ابابیل مختلف قسم کے خیالات میں اُلجھ گئی اور سوچتے سوچتے سو گئی۔ کیونکہ سوچنے اور فکر کرنے سے ہمیشہ نیند آجاتی ہے۔ صبح کو جب دن نکلا تو وہ دریا کی طرف اُڑ گئی اور نہانے لگی۔ اُس وقت اتفاق سے "خصوصیات طیور" کے ایک پروفیسر پل پر سے گذر رہے تھے۔ اُن کی نظر جو ابابیل پر پڑی تو وہ حیران ہو کر کہنے لگے :۔ "ہائیں! جاڑوں میں ابابیل" اس کے بعد پروفیسر نے ایک بڑا طویل مراسلہ مقامی اخباروں میں شائع کر دیا اور ہر اخبار نے اس خط کو شائع کیا۔

ابابیل نے کہا کہ آج رات کو میں مصر چلی جاؤں گی اور واقعی مصر کے پرلطف مناظر کا خیال کرکے اُس وقت وہ روانہ ہو گئی، وہ گرجا کے مینار کے پاس ہو کر گزری جہاں فرشتوں کے مجسمے سفید سنگ مرمر کے رکھے ہوئے تھے وہ قصر شاہی کے پاس سے ہو کر گزری اور رقص و سرود کی آوازیں سنیں ایک حسین لڑکی اپنے عاشق کے ساتھ نکلکر بالاخانہ پر آئی اور عاشق ستاروں بھری رات کو دیکھکر کہنے لگا۔

"ستارے کس قدر دلکش ہیں۔ اور عشق و محبت کی طاقت بھی کسقدر زبردست ہوتی ہے"

لڑکی۔ اُمید ہے کہ بزم رقص و سرود منعقد ہونے تک میری پوشاک بھی تیار ہو جائیگی میں نے حکم دیا ہے کہ اس پر خوبصورت پھول کاڑھے جائیں لیکن یہ سینے والیاں بھی کسقدر کاہل اور سست ہوتی ہیں۔

ابابیل اڑتی ہوئی دریا پر سے گزری۔ اور جہازوں کے مستولوں پر لٹکی ہوئی لالٹینیں دیکھیں۔ وہ یہودیوں کے محلہ سے ہو کر گزری اور بڈھے بڈھے یہودیوں کو ایک دوسرے سے سودا کرتے اور تانبے کی ترازوؤں میں روپیہ تولتے دیکھا بالآخر وہ اُڑتی اُڑتی اس گھر تک پہونچی اور اندر جھانکا۔ لڑکا بخار میں مبتلا چارپائی پر تڑپ رہا تھا اور ماں کی آنکھ لگ گئی تھی بیچاری کام کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ ابابیل کمرہ کے اندر داخل ہوئی اور اپنے بازوؤں سے لڑکے کی پیشانی کو ہوا دی اور وہ لعل میز پر انگشتانہ کے قریب رکھدیا۔ اس کے بعد اس نے پلنگ کے گرد آہستہ آہستہ اُڑ کر بچہ کو ہوا دی، وہ بولا "اس وقت کیسی خوشگوار خنکی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ میری طبیعت اب اچھی ہوتی جاتی ہے" یہ کہا اور لڑکا پھر سو گیا

ابابیل پھر اُڑتی ہوئی شہزادہ خرم کے پاس پہونچی اور سارا حال بیان کرکے بولی۔

بہت خوش تھی۔ اِس کے بعد وہ اُڑی اور شہر کے تمام مشہور مقامات کو دوبارہ جا کر دیکھا۔ وہ بہت دیر تک گرجا کی چوٹی پر بیٹھی رہی۔ جہاں جہاں ابابیل جاتی، اُسے دیکھ کر چڑیاں چہچہاتیں اور آپس میں کہتیں "یہ اجنبی کسقدر رخشاندار اور دلکش چیز ہے۔" الغرض ابابیل نے خوب سیر کی۔

جب چاند نکلا تو وہ پھر اُڑ کر شاہزادہ خرم کے پاس گئی اور بولی "کیا صاحب عالم کا کوئی کام مصر میں بھی ہے کیونکہ اب میں جا رہی ہوں۔"

بُت "کیا تم میرے پاس ایک رات اور نہیں ٹھہر سکتیں۔"

ابابیل "نہیں مصر میں میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔ کل میرے تمام احباب دوسری آبشار کی طرف چلے جائیں گے وہاں لمبی لمبی گھانس پانی میں لہریں لیا کرتی ہے اور سنگ خارا کے ایک تخت پر خداوند ممنون (MEMNON) متمکن ہے رات بھر اُس کی آنکھیں آسمان کے ستاروں کو تکتی رہتی ہیں۔ اور جب صبح کا ستارہ نمودار ہوتا ہے تو وہ ایک نعرۂ مسرت لگاتا ہے اور خاموش ہو جاتا ہے۔ دوپہر کو بھورے اور زرد رنگ کے شیر ببر پانی پینے لب جو آتے ہیں جنکی آنکھیں ہلکے رنگ کے فیروزوں کی طرح چمکتی ہیں۔ اور جن کی گرج آبشوروں کے شور سے زیادہ بلند ہوتی ہے۔"

بُت "میں ایک نوجوان کو کوٹھے پر بیٹھا دیکھتا ہوں وہ ایک میز پر جُھکا ہوا ہے جس پر بہت سے کاغذ رکھے ہوئے ہیں۔ اُس کے برابر ایک گلاس رکھا ہوا ہے جس میں بنفشہ کے افسردہ پھول ہیں۔ اُس کے بال بھورے اور سخت ہیں اُس کے لب انار کی طرح سُرخ ہیں۔ اُس کی آنکھیں بڑی بڑی اور خمار آلود ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ تھیٹر کے ڈائرکٹر کے لئے ایک ڈرامہ جلد ختم کر دے لیکن اُس کے ہاتھ جاڑے کی شدت سے اکڑے ہوئے ہیں اور وہ لکھ نہیں سکتا۔ آتشدان میں آگ نہیں ہے اور بھوک کے مارے وہ بیہوش ہوا جاتا ہے۔"

یہ سُنکر ابابیل نے جو بہت نیکدل چڑیا تھی کہا "اچھا میں آپ کے پاس ایک شب اور قیام کروں گی۔ کیا میں اُس نوجوان کے پاس کوئی دوسرا لعل لے جاؤں؟"

بُت: "افسوس ہے کہ اب میرے پاس اور کوئی لعل نہیں۔ صرف میری آنکھیں باقی رہ گئی ہیں۔ یہ نہایت نفیس نیلم کی بنی ہوئی ہیں جو تقریباً ایک ہزار سال گزرے ہندوستان سے لائے گئے تھے۔ پس تم میری ایک آنکھ نکال لو اور اُس نوجوان کے پاس لے جاؤ۔ وہ یہ نیلم کسی جوہری کے ہاتھ فروخت کر دے گا۔ اور اُس کی قیمت سے وہ کھانا اور لکڑی خرید لے گا اور ڈرامہ ختم کر دے گا۔"

یہ سُنکر ابابیل کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ رو کر کہنے لگی "جناب یہ تو مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔"

بُت "کوئی حرج نہیں تم وہی کرو جو میں کہتا ہوں۔"

مجبور ہو کر ابابیل نے شہزادہ کی ایک آنکھ سے نیلم نکالا اور اُسے لیکر نوجوان کے مکان کی طرف اُڑ گئی چونکہ چھت میں ایک سوراخ تھا اِس لئے اندر داخل ہونا بہت آسان تھا نوجوان اپنا سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اِس لئے وہ ابابیل کے پروں کی آواز نہ سُن سکا۔ اور جب اُس نے نگاہ اُٹھا کر اُوپر دیکھا تو اُس نے کمھلائے ہوئے گلدستہ میں ایک خوبصورت اور آبدار نیلم دیکھا اور دیکھتے ہی خوش ہو گیا اور دل میں کہنے لگا "شاید کسی عظیم الشان ہستی نے

میری کوششوں کو بنظرِ استحسان دیکھا ہے اور یہ تحفہ بھی اسی نے بھیجا ہے بس اب میں اپنا ڈرامہ ختم کر یوں گا۔"

دوسرے روز ابابیل اُڑ کر بندرگاہ کی طرف گئی اور ایک جہاز کے مستول پر بیٹھی اور ملاحوں کو دیکھنے لگی جو نیچے کے گودام سے رسّوں میں باندھ کر بڑے بڑے وزنی صندوق نکال رہے تھے۔ جب کوئی صندوق اُوپر آجاتا تھا تو نعرہ لگاتے تھے "شاباش میرے بھائی"۔ یہ سُن کر ابابیل کو بھی کچھ اُمنگ سی آئی اور چلّا کر کہنے لگی "میں بھی اب مصر کو چلی" الغرض شام کو جب چاند نکلا تو وہ اُڑ کر پھر شاہزادہ خرم کے پاس پہونچی اور بولی۔

"..... اب میں جناب سے رخصت ہونے

آئی ہوں"

بُت "کیا تم میرے پاس ایک رات اور نہ ٹھہرو گی؟"

ابابیل: "اب جاڑوں کا زمانہ ہے اور یہاں بہت جلد برف پڑنے لگے گی لیکن مصر میں ابھی ہرے بھرے نخلستانوں پر آفتاب چمک رہا ہے۔ دریا سے نہنگ نکلکر ساحل کی ریت پر لوٹتے ہیں اور مضمحل نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ میرے ساتھی بَعل کے مندر میں آشیانہ بنا رہے ہیں سفید قمریاں اور گلابی فاختہ کو کو کر رہی ہیں، اب مجھے آپ رخصت کیجئے میں آپ کی یاد ہمیشہ دل میں رکھوں گی اور آئندہ فصل بہار میں ان جواہرات کے بجائے جو آپ کی دریا دلی نے لوگوں کو عطا فرما دیئے ہیں۔ میں آپ کے لئے دو بہت خوبصورت اور نفیس جواہر لاؤں گی، میرا لعل رنگ اور آب و تاب میں سُرخ گلاب سے بھی زیادہ بہتر اور میرا نیلم سمندر کے نیلگوں پانی سے بھی زیادہ خوش آب ہوگا۔"

بُت: "نیچے دیکھو بازار میں ایک چھوٹی سی دیا سلائی بیچنے والی لڑکی کھڑی ہے۔ اُس نے نابدان میں ڈالکر اپنی تمام دیا سلائیاں خراب کردی ہیں۔ اب وہ کھڑی رو رہی ہے کیونکہ اگر وہ دیا سلائی بیچکر گھر پیسے نہ لے گئی تو اُس کا باپ اُسے بہت ماریگا اُس لڑکی کے پاؤں میں نہ جوتیاں ہیں نہ موزے۔ اُس کا ننھا سا سر بھی ننگا ہے۔ اب تم میری دوسری آنکھ بھی نکال لو اور لیجا کر اُس لڑکی کو دے آؤ۔ تاکہ یہ مصیبت سے بچ جائے۔"

ابابیل: "میں آپ کے پاس ایک رات اور ٹھہر سکتی ہوں۔ لیکن آنکھ نہیں نکال سکتی کیونکہ آپ جب دونوں آنکھوں سے محروم ہو جائیں گے تو کیا کریں گے۔"

بُت: "نہیں جو میں حکم دیتا ہوں وہی کرو۔"

ابابیل نے شہزادہ کی دوسری آنکھ بھی نکال لی۔ اور لیکر نیچے کی طرف اُڑی اور وہ اس لڑکی کے پاس سے منڈلاتی ہوئی گذری اور اس کی ہتیلی پر وہ نیلم آہستہ سے رکھدیا نیلم کو دیکھکر لڑکی خوش ہوگئی اور کہنے لگی: "کیا پیارا شیشے کا ٹکڑا ہے" وہ ہنستی ہوئی نیلم لیکر گھر کی طرف دوڑ گئی اس کے بعد ابابیل پھر شہزادہ کے پاس آئی اور بولی۔

"..... چونکہ آپ کی بینائی بالکل جاتی رہی ہے اس لئے میں ہمیشہ آپ ہی کی خدمت میں رہا کرونگی"

بُت: "نہیں میری پیاری ابابیل! اب تم مصر کی طرف جاؤ"

ابابیل: "نہیں اب تو میں یہیں رہوں گی"

اس کے بعد ابابیل پروں میں سر چھپا کر شہزادہ کے

پیروں کے درمیان سوگئی۔ وہ دوسرے روز بھی تمام دن شہزادہ کے قدموں میں بیٹھی رہی۔ اور ممالک غیر میں جو جو باتیں اس نے دیکھی تھیں اُن کا حال بیان کرتی رہی اُس نے مصر کی سُرخ رنگ مقدس چڑیوں کا حال بیان کیا جو دریائے نیل کے کنارے لمبی لمبی قطاریں باندھے بیٹھی رہتی ہیں اور اپنی چونچ سے سنہری مچھلیاں پکڑتی ہیں۔ اُس نے ابوالہول کا ذکر کیا جو ریگستان میں رہتا ہے اور ہر چیز کا حال جانتا ہے۔ اُس نے اُن تاجروں کا حال بیان کیا جو آہستہ آہستہ اُونٹوں کے ساتھ چلتے ہیں اور جن کے ہاتھوں میں کہربا کی تسبیحیں ہوتی ہیں۔ اُس نے جبال القمر کے بادشاہ کا قصہ سُنایا جو آبنوس کی طرح سیاہ ہے اور ایک بڑے بلور کی پوجا کرتا ہے۔ اُسنے ایک بڑے سبز رنگ سانپ کا حال سُنایا، جو ایک کھجور کے درخت میں رہتا ہے اور بیس پجاری اُسے دودھ پلاتے ہیں۔ اُس نے اُن بالشتیوں کا حال سُنایا جو ایک جھیل میں بڑے پتوں کی کشتیاں چلاتے ہیں اور تیتریوں کے ساتھ ہمیشہ لڑتے رہتے ہیں۔

بُت:۔ "اے ابابیل! تم نے مجھے عجیب عجیب باتیں سنائیں لیکن ان سب سے زیادہ حیرت انگیز انسان کے آلام و مصائب ہیں۔ دُنیا کا کوئی راز اس قدر زبردست نہیں جتنا کہ رنج و ملال، اب تم میرے شہر کی فضا میں پرواز کرو اور جو کچھ تم دیکھو اسے بیان کرو۔"

پس وہ ابابیل اس عظیم الشان شہر کی فضا میں اُڑی اور امیروں کو دیکھا کہ اپنے خوبصورت محلوں میں رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ اور غریب لوگ دروازوں پر بیٹھے ہیں وہ تنگ و تاریک کوچوں میں گئی اور زرد رُو بچوں کو دیکھا جو فاقے کر رہے ہیں۔ اُس نے ایک پل کے دَر میں محراب کے نیچے دو چھوٹے لڑکوں کو دیکھا جو ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے پڑے تھے تا کہ اسی طرح وہ کسی قدر گرم ہو جائیں اور سردی سے محفوظ رہیں، لیکن ایک چوکیدار آتا ہے اور انھیں ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے کہ "خبردار یہاں نہ لیٹنا" اور وہ دونوں بیچارے پُل کے نیچے سے بارش میں نکل جاتے ہیں۔ یہ تمام باتیں دیکھ کر وہ ابابیل اُڑتی ہوئی پھر شہزادہ کے پاس واپس آئی اور جو کچھ دیکھا تھا بیان کیا۔

بُت:۔ "دیکھو مجھ پر سونے کے پتر چڑھے ہیں۔ تم انہیں نوچ نوچ کر لیجاؤ اور غربا و مساکین کو دو۔"

الغرض ابابیل نے سونے کے تمام پتر نوچ لئے حتیٰ کہ شہزادہ خرم بالکل بھدا اور سیسہ کے رنگ کا دکھائی دینے لگا یکے بعد دیگرے سونے کے تمام پتر غربا و مساکین کو لا کر دے دیئے گئے۔ اب بچوں کے چہرے سُرخ و سفید نظر آنے لگے۔ وہ آپس میں ہنستے اور گلیوں میں کھیلتے پھرتے تھے۔ اور بآواز بلند کہتے تھے کہ "ہاں اب ہمکو روٹی ملتی ہے۔"

اِس کے بعد برف پڑنے لگی اور برف کے بعد پالا پڑنا شروع ہوا۔ سڑکیں ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا چاندی کی بنی ہوئی ہیں برف کی لمبی لمبی قلمیں مکانات کی اولتیوں پر ایسی لٹکتی تھیں گویا بلوری خنجر لٹک رہے ہیں۔ جو شخص باہر نکلتا تھا سمور پہنکر نکلتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے سُرخ بانات کی ٹوپیاں پہنے برف پر پھسل پھسل کر کھیلتے تھے۔

غریب ابابیل روز بروز ٹھٹھری جاتی تھی۔ لیکن فرطِ محبت سے شہزادہ کو نہیں چھوڑتی تھی۔ وہ نانبائی کی دوکان کے سامنے سے اُس کی غیر حاضری میں روٹی کے ریزے چُن چُن کر کھاتی اور اپنے آپ کو گرم رکھنے کے لئے

پر پھٹ پھٹاتی۔ آخر کار اُسے محسوس ہونے لگا کہ موت کے دن قریب آ گئے ہیں اب اس میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ وہ اُڑ کر پھر شہزادہ کے شانہ پر آ کر بیٹھ جاتی۔ اُس نے کہا کہ "صاحب عالم! خدا حافظ! کیا آپ مجھے اپنا ہاتھ چومنے کی اجازت دیں گے؟"

بت:۔ "میں خوش ہوں کہ اب آخر کار تم مصر جا رہی ہو۔ تم یہاں بہت عرصہ تک ٹھہری رہیں لیکن چونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اس لئے ہاتھوں کی بجائے تم میرے لب کو بوسہ دو۔"

ابابیل:۔ "نہیں میں مصر نہیں جا رہی ہوں بلکہ دنیا سے جا رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر ابابیل نے شہزادہ کے لبوں کو بوسہ دیا۔ اور مر کر اس کے قدموں پر گر پڑی۔

عین اُسی وقت کسی چیز کے شق ہونے کی عجیب آواز بت کے اندر سے آئی۔ گویا کوئی چیز ٹوٹی ہے شہزادہ کا دل جو سیسہ کا بنا ہوا تھا پھٹکر بالکل دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ پالا نہایت سخت پڑ رہا تھا۔

دوسرے روز صبح کو امیر بلدیہ مع اپنے ارکان کے نیچے چوک میں پھر رہا تھا۔ جس وقت یہ لوگ مینار کے پاس سے گزرے تو انھوں نے بت کی طرف دیکھا۔ دیکھتے ہی امیر بلدیہ بولا:۔ "یہ شہزادہ کا بت کسقدر بھدا نظر آتا ہے۔"

"بیشک بھدا ہو گیا ہے" ارکانِ بلدیہ نے ہاں میں ہاں ملائی۔ کیونکہ وہ ہمیشہ "ہاں میں ہاں" ملانے کے اُصول پر عمل کرتے تھے اور امیر بلدیہ کے خلاف کچھ نہیں کہتے تھے۔

امیر بلدیہ:۔ "تلوار کے قبضہ سے لعل گر چکا ہے۔ آنکھوں سے نیلم نکلکر گر پڑے ہیں۔ اور سونے کے پتر بھی نہیں رہے اب تو شہزادہ فقیر سا نظر آتا ہے۔"

ارکانِ بلدیہ:۔ "درست فرمایا۔ بالکل فقیر سا معلوم ہوتا ہے۔"

امیر بلدیہ:۔ "اور یہ تو دیکھئے شہزادہ کے قدموں میں ایک چڑیا پڑی ہے۔ اب واقعی ایک فرمان جاری کرنا پڑیگا کہ آئندہ کسی پرندہ کو یہاں آ کر مرنے کی اجازت نہ ہوگی۔"

منشی نے فوراً امیر بلدیہ کی بات نوٹ کر لی۔ پس ان لوگوں نے شہزادہ کے مجسمہ کو تُڑوا ڈالا۔ اور یونیورسٹی کے ماہرین فنون لطیفہ نے تو یہاں تک کہدیا کہ "چونکہ یہ بُت خوبصورت نہیں رہا لہذا مفید بھی نہیں رہا۔"

شہزادہ کا بُت ایک بھٹی میں پگھلایا گیا۔ اور امیر بلدیہ نے ارکان بلدیہ کا ایک ضروری جلسہ طلب کیا تا کہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ بُت کی دھات کس کام میں لائی جائے۔ خود امیر بلدیہ نے فرمایا کہ "یقیناً ہمیں ایک دوسرا بت بنوانا پڑے گا۔ اور وہ بت میرا ہوگا" اسپر ہر رکن نے "میرا میرا میرا" کا راگ الاپنا شروع کر دیا۔ اور آپس میں خوب جنگ ہوئی۔

کارخانہ فلزات کے مہتمم نے کاریگروں سے کہا:۔ "یہ عجیب بات ہے کہ اس بت کا دل بھٹی میں پگھلتا ہی نہیں پھر کیا کیا جائے۔ اچھا اسے پھینکدو۔"

الغرض انہوں نے شہزادہ کے دل کو مزبلہ پر پھینکدیا جہاں ابابیل کی لاش پہلے سے پڑی ہوئی تھی۔

خدا نے اپنے فرشتوں میں سے ایک کو حکم دیا کہ جاؤ اس شہر میں جو سب سے بیش قیمت دو چیزیں ہوں وہ میرے پاس لاؤ۔ فرشتہ آیا اور "سیسہ کا دل اور ابابیل کی

لاش" اٹھائے گیا۔ خدا نے فرمایا۔ "بیشک تم نے نہایت صحیح انتخاب کیا میری فردوس میں یہ پرندہ ہمیشہ چہچہاتا رہیگا اور میرے شہر زرنگار میں شاہزادہ خرم ہمیشہ میری حمد و ثنا میں مصروف رہیگا۔"

گرفتاری

ولیم سڈنی پورٹر (۱۸۶۲ - ۱۹۱۰ء) امریکی افسانہ نویس جو ادبی دنیا میں "او ہنری" کے قلمی نام سے مشہور ہے پہلے بنک میں کلرک تھا لیکن ۱۸۹۵ء میں وہ اخبار کا نمائندہ ہو گیا۔ اس کے مختصر افسانے' مزاح لطیف اور طنز کی وجہ عام مقبولیت اور ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ افسانہ Soapy اس کی طرز نگارش کی مکمل جھلک ہے جسے مشہور مزاحیہ نگار "ناکارہ" حیدر آبادی نے اپنے انداز میں آزاد ترجمہ کیا ہے۔

خیراتی' پارک میں بیٹھا کانپ رہا تھا۔ اُس کے دانتوں کے بجنے کی آواز مبالغہ کے ساتھ ایک فرلانگ اور بلا مبالغہ دس گز تک سُنائی دے رہی تھی۔ جب عورتیں جن کے پاس گرم کپڑے نہ ہوں اپنے شوہروں پر مہربان ہو جائیں۔ اور جب خیراتی پارک میں بیٹھکر کانپنے لگے . . . . اور اُسکے دانتوں کے بجنے کی آواز مبالغہ کے ساتھ ایک فرلانگ اور بلا مبالغہ دس گز تک سُنائی دے۔ تو سمجھ لیجئے کہ حضرت سرما تشریف لے آئے ہیں۔

جاڑے نے اپنے سالانہ رونق افروزی سے قبل حسب معمول اپنے ہرکارے دوڑا دیئے تھے۔ اور سرد ہوائیں چل چل کر لوگوں سے کہہ رہی تھیں کہ تیار ہو جاؤ۔ خیراتی پارک میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اُس شخص کے لئے جس کا گھر بار نہ ہو اور جس کی گذران دوسروں کے جیبیں کترنے اور اُنکی چیزیں نہایت صفائی سے تھیا لینے کے طفیل ہوتی ہے۔ اس کمبخت سردی سے بچنے کی کونسی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

آج تک شہر کی دکانوں اور مکانوں کے چبوترے اُس کی خواب گاہ کا کام دے رہے تھے۔ وہ اب تک اوڑھنے اور بچھونے سے بے نیاز رہا۔ مگر پچھلی رات جب وہ پارک میں ایک بنچ پر تاروں کی چھاؤں میں سُویا تو اُسے معلوم ہوا کہ اس موسم میں ایسے ننگے مقامات پر خرّاٹے لیتے نظر آنا بائیں ہاتھ کا کھیل نہیں۔ عجب نہیں اگر مسلسل چار پانچ رات اسی طرح سونے پر قلب رُوٹھ جائے اور حرکت کرنے سے صاف انکار کر دے اور یوں آبادی میں سے ایک عاقل' بالغ مرد کی کمی ہو جائے اس میں شک نہیں کہ شہر میں بہت سے سرکاری یتیم خانے اور خیرات خانے تھے۔ جہاں اگلے تین مہینوں تک اس کو قیام و طعام مل سکتا تھا۔ مگر خیراتی جیسے غیور انسان کو یہ کب گوارا تھا۔ اُس نے آج تک بھیک نہیں مانگی تھی۔ اگر وہ اس طرف توجہ کرتا تو ایک کامیاب گداگر ہوتا۔ اور چاہتا تو ایک زبردست گداگر جماعت کھڑی کر دیتا جو ناد ہندوں کے لئے طاعون اور ہیضہ سے بڑھکر بلائے مبرم ثابت ہوتی۔ مگر اُس کو اِس

عالمگیر فن سے نفرت تھی جس طرح آپ پیسے دیکر کوئی چیز (چاہے وہ بیماری ہی کیوں نہ ہو) مول لیتے ہیں۔ اسطرح آپ اپنی غیرت وحمیت دیکر بھیک لیتے ہیں۔ خیراتی کی رائے میں قانون خیرات سے زیادہ شفیق تھا۔ لہٰذا اُسے بہتر معلوم ہوا کہ تین ماہ تک حکومت اور قانون کے مہمان رہنا چاہیئے اگرچہ قانون قواعد وضوابط کے تحت کام کرتا ہے۔ مگر وہ کسی شریف آدمی کے پرائیوٹ معاملات میں کبھی دخل نہیں دیتا۔ تین مہینے جیل خانے میں اُس کے لئے خیراتی اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھا۔ تین ماہ کے لئے جیل خانے کا کھانا، کپڑا اور بچھونا۔ اور پھر فخر ملک وملت افراد کی صحبت جو کہیں اور میسر نہیں آسکتی کیونکہ خیراتی کو اُس کا کامل یقین تھا کہ حکومت کے اس مہمان خانے میں بہت سے اعلیٰ دل و دماغ کے لوگ موجود ہونگے۔ اور ان کی کثیر تعداد شہر کی گھنی آبادی پر دال ہوگی۔

خیراتی جیل خانے کی ہوا کھانے کا عزم بالجزم کر چکا تو سوچنے لگا کہ کس طرح وہاں تک رسائی ہو سکتی ہے۔ ویسے بھی اُس کے بہت سے آسان طریقے تھے۔ مثلاً مسجد میں نمازیوں کے قیمتی جوتے چرانا اور پکڑے جانا یا کسی شخص پر لٹھ سے حملہ کرنا اور بھاگ نہ جانا وغیرہ وغیرہ۔ مگر سب سے زیادہ مہذب اور فرحت بخش طریقہ یہ تھا۔ کسی شاندار ہوٹل میں خوب پیٹ بھر کر کھانا۔ بل کی ادائی کے وقت کوٹ کی پھٹی ہوئی جیبیں باہر نکال دینا۔ اور پھر پولیس والے کی مشفقانہ سرپرستی میں اپنے آپ کو بغیر غل غپاڑہ اور ہاتھا پائی کے حوالہ کر دینا۔ باقی باتوں کا پہلے اللہ اور پھر مجسٹریٹ مالک تھا۔

اس لاجواب تجویز کا خیال آتے ہی خیراتی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ بیقرار ہو کر اُٹھا اور پارک سے باہر نکل آیا۔ پانچ منٹ تک "دم بنانے" کے بعد وہ ایک جگمگ جگمگ کرنے والے ہوٹل کے سامنے ٹھہر گیا۔ ایک بڑے بورڈ پر لکھا تھا "خوش آمدید"۔

خیراتی نے اپنے اُوپر ایک تنقیدی نظر ڈالی اُس کے کوٹ میں جو حقیقت میں اُس کا اپنا نہ تھا۔ کوئی نقص نہیں تھا اگر وہ صحیح سلامت رسٹوران کی ایک میز تک پہنچ سکے کا میابی اُس کے قدموں میں لوٹتی ہوگی۔ اُس کے جسم کا وہ حصہ جو میز کے اُوپر ہوگا ملازم کے دل میں کوئی شبہ نہ پیدا کریگا اور جب وہ ایک آدھ گھنٹہ کے بعد کانسٹیبل کے ساتھ باہر نکلیگا تو اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔ اور اُس کی منزل مقصود کے سفر کے دوران میں اُسے بھوک ہرگز نہ ستائے گی۔

مگر جونہی خیراتی نے رسٹوران کے بورڈ کو لبیک کہتے ہوئے اللہ کا نام لے کر اندر قدم رکھا، صدر ملازم کی نظر اُس کے زخمی پاجامہ اور مسکراتے ہوئے جوتے پر پڑی۔ پلک جھپکنے میں مستعد اور مضبوط ہاتھ اُس کی مدد کو پہنچے۔ اور خاموشی سے اُس کو سیدھی راہ بتلادی خیراتی جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی چل پڑا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہوٹل والے بڑے گھر کا راستہ بتانے سے قاصر تھے قید خانہ میں داخل ہونیکا کوئی دوسرا طریقہ سوچنا چاہیئے۔

سڑک کی موڑ پر ایک شاپ تھی جس کی کھڑکی کے اندر نفیس اور قیمتی سامان بجلی کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ خیراتی نے ایک پتھر اُٹھایا اور شیشے پر دے مارا۔ لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے اور موڑ پر ایک پولیس مین نمودار خیراتی نے چپ چاپ اپنی پھٹی ہوئی جیبوں میں

ہاتھ ڈال لئے اور سیاہ پوش شخص کو دیکھتے ہی مسکرا پڑا۔
"کہاں ہے وہ بدمعاش؟" کانسٹبل نے کڑک کر پوچھا۔

"کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس میں میرا ہاتھ ہوگا؟" خیراتی نے طنز سے کہا مگر وہ خوش تھا کیونکہ اب کے قسمت نے اُسے دغا نہیں دی تھی۔

سپاہی کے دماغ نے خیراتی کا مجرم ٹھہرانے سے

"او۔ہنری"

انکار کیا۔ کھڑکیوں کے شیشے توڑنے والے بدمعاش پولیس والوں سے بحث مباحثہ کرنے نہیں ٹھہرتے وہ دُم دبا کر بھاگتے ہیں۔ تھوڑے فاصلہ پر ایک شخص ٹیکسی کو پکڑنے بے تحاشا دوڑ رہا تھا۔ اُس کو دیکھتے ہی ڈنڈا سنبھال کر اُس کے پیچھے لپکا۔ خیراتی کو سنے دیتا ہوا وہاں سے چل کھڑا ہوا۔

یہ اُس کی دوسری ناکامی تھی۔

سڑک کی دوسری جانب ایک متوسط درجہ کا ہوٹل تھا۔ شدت کی بھوک اور خالی بٹوے رکھنے والے یہاں آتے تھے۔ یہاں چینی کے برتن ٹوٹے اور شوربہ پتلا ہوتا تھا اس ہوٹل میں خیراتی اپنے زخمی پاجامہ اور مسکراتے ہوئے جوتوں کو ساتھ لے گیا۔ مگر اس دفعہ شکم پروری کی ہوس اُس کے دل ہی دل میں نہ رہی۔ پیٹ بھر کر کھا چکا تو اُس نے ڈکار لیتے ہوئے ملازم کی معلومات میں دہشت انگیز اضافہ کیا کہ اُس کے لئے پیسہ ایک بالکل اجنبی چیز ہے۔

"ناکارہ"

"چلو۔ جلدی کرو۔ پولیس والے کو بلاؤ" خیراتی نے کہا "اور ایک شریف آدمی کو انتظار کی تکلیف مت دو۔"

اُس کے لئے پولیس والے کو بلانے کی ضرورت نہ تھی۔ "لیجئے جناب!" دو ملازموں نے اسے کرسی پر سے اُٹھایا اور باہر سخت سڑک پر ——

خیراتی زمین بوسی کے بعد آہستہ آہستہ اُٹھا جیسے بڑھئی کا رول کھلتا ہے۔ اور اپنے کپڑوں سے

گرد جھاڑنے لگا۔ گرفتاری اُس کو ایک خواب معلوم ہونے لگی۔
بڑا گھر سات سمندر پار نظر آنے لگا۔ ایک کانسٹبل جو دس قدم
کے فاصلہ پر ایک اسٹور کے سامنے کھڑا تھا، ہنسا اور چل دیا۔

بہت دیر تک خیراتی کو ہمت نہ پڑی کہ اپنی گرفتاری
حاصل کرنے کی ایک اور کوشش کرے۔ مگر ایک "فلاں اینڈ
کو جنرل مرچنٹ" کی شاپ کے سامنے آسے ایک نایاب
موقعہ ہاتھ آیا۔ ایک جوان عورت، خوبصورت نہیں تو بدصورت
بھی نہیں۔ بظاہر کسی کے انتظار میں کھڑی تھی اور دو گز کے
فاصلہ پر ایک ہٹا کٹا پولیس مین اپنے شایانِ شان ڈنڈا لئے
ٹہل رہا تھا۔

خیراتی نے اپنے دل میں کہا "یار لچے لفنگے تماش بین
کا پارٹ کرا اور اپنی آنکھیں سینک۔ ہوں!" اس کے شکاری کی
وضع قطع اور لباس سے اور پولیس کے وفادار سپاہی کی
قربت سے اس کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ بہت جلد اس ہٹے
کٹے سپاہی کے آہنی پنجہ کی گرفت کو محسوس کرے گا جس کے
معنی یہ ہونگے کہ اُس کو جیل خانہ سے بلاوا آیا ہے۔

خیراتی نے اپنی ٹوپی ٹیڑھی رکھ لی۔ جیبوں میں ہاتھ
ڈال لئے۔ اور سیٹی بجاتا ہوا عورت کی طرف بڑھا۔ اُس نے
اشارے کئے مسکرایا۔ کھانسا۔ کھنکارا اور وہ سب کچھ
کیا جو بدمعاش ایسے موقعوں پر کیا کرتے ہیں۔ خیراتی نے
کنکھیوں سے دیکھا کہ کانسٹبل اُس کے حرکات و سکنات کا بغور
مطالعہ کر رہا ہے۔ جوان عورت چند قدم آگے بڑھ گئی۔ خیراتی
نے اُس کا پیچھا کیا اور قریب پہنچ کر بولا۔ "جانِ من گھر نہیں
چلو گی؟"

کانسٹبل یہ ماجرا دیکھ رہا تھا۔ مظلوم عورت کی ایک انگلی
کا اشارہ کافی تھا۔ خیراتی اپنے محل کی طرف سفر کر رہا ہوگا۔ ابھی
سے وہ تھانہ کی دل خوش کن گرمی محسوس کرنے لگا۔ جوان
عورت نے مڑ کر اپنا ہاتھ بڑھایا اور خیراتی کے کوٹ کا دامن
پکڑ لیا۔

"بے شک چلونگی۔ پیارے!" وہ خوش ہو کر بولی "میں
تم سے خود ہی کہتی۔ مگر سپاہی دیکھ رہا تھا۔"

خیراتی کے دل پر اُداسی چھا گئی۔ وہ اپنی "جان من"
کو ساتھ لئے سپاہی کے سامنے سے گذر گیا۔ ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ اُس کی قسمت ہی میں آزادی لکھی ہے۔ اگلی موڑ
پر وہ اپنی رفیقہ کو جھٹک کر بھاگا۔ اور ایک شاندار ہوٹل کے
سامنے پہنچ کر دم لیا۔ یکایک ایک خوفناک خیال اُس کے
دل میں آیا۔ کہیں اُس پر جادو تو نہیں کیا گیا۔ جو گرفتاری اُس
کے پاس پھٹکتی نہیں؟ اِس خیال کے آتے ہی وہ بدحواس
ہو گیا۔ پاس ہی ایک پولیس مین کھڑا تھا۔ ڈوبتے کو تنکے کا
سہارا ملا۔ خیراتی نے شرابی کا روپ بھرا۔ اُس کی مضبوط ٹانگیں
لڑکھڑانے لگیں۔ اور وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر فحش ترانے الاپنے
لگا۔

کانسٹبل نے ہنسکر اپنا ڈنڈا اٹھایا "آگے جاکر۔ آگے جاکر۔
یہاں نہیں" اُس نے کہا۔

خیراتی کے جی میں آئی کہ سپاہی کو ایک زور کی دھول
رسید کرے۔ اس نے اپنا بے سود اور بے سُرا گانا ختم کر دیا
کیا کوئی پولیس والا اُس کو گرفتار نہیں کرے گا؟ کیا جیل خانے
جانے کی حسرت دل ہی دل میں رہ جائے گی؟ کیا ہی بہتر
ہوگا اگر کوئی پولیس مین فرشتۂ رحمت بن کر اُس پر نازل ہو!
خیراتی اپنے آپ کو اُس کی گردن پر ڈال دیگا۔

ایک پان والے کی دوکان کے سامنے اُس نے
دیکھا کہ ایک شخص اپنی چھتری کو پاس رکھے سگریٹ سلگا رہا تھا

خیراتی نے چھتری اُٹھالی۔ اور چلتا بنا وہ شخص "ارے ارے! ہاں۔ ہاں! میری چھتری" کہتا ہوا اُس کے پیچھے پیچھے آیا۔

چوری پھر سرزوری۔ خیراتی زیرلب بڑبڑایا "اوہ! تمھاری چھتری؟ تو پولیس والے کو کیوں نہیں پکارتے۔ میں نے بلاشبہ اُٹھائی۔ اُٹھائی نہیں چرائی۔ پر تم پولیس والے کو کیوں نہیں بلاتے؟ وہ دیکھو تھانہ کے سامنے ایک کھڑا ہے"

چھتری کے مالک نے اپنی رفتار دھیمی کردی خیراتی نے اُس کی تقلید کی اس اندیشہ سے کہ کہیں پھر ناکامی کا مُنہ دیکھنا نہ پڑے۔ اور گرفتاری راستہ نہ کترا جائے۔ کانسٹبل ان دونوں سے بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔

"اچھا" چھتری کے مالک نے کہا "تو یہ آپ —— یعنے واللہ آپ جانتے ہیں کہ اسی طرح مغالطے پیش آتے ہیں —— میں —— اگر یہ آپ کی چھتری ہے تو میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ آج صبح میں ایک ہوٹل سے اُٹھالایا تھا —— اگر آپ اپنی چھتری کو پہچان گئے ہیں تو مجھے اُمید ہے کہ آپ —————"

"یقیناً میری ہے" خیراتی بولا۔

سابق مالک چھتری چل دیا۔ پولیس مین ایک تانگہ کی طرف جو سڑک پر بے ٹکے پن سے کھڑا تھا۔ متوجہ ہوا خیراتی نے ایک سرد آہ کھینچی اور چل پڑا۔ اُس کا گذر ایک گلی میں سے ہوا۔ اُس نے جھنجھلا کر چھتری ایک گڑھے میں پھینکدی اور کوسنے لگا اُن آدمیوں کو جو سیاہ وردی زیب تن کئے اور ڈنڈے ہاتھوں میں لئے اکڑتے پھرتے ہیں۔ وہ خود کو ان کے ہاتھوں میں پھنسانا چاہتا تھا۔ مگر وہ ہیں کہ اُس کو بے ضرر اور شریف سمجھ کر ہاتھ تک نہیں لگاتے۔

آخر بیزار ہو کر خیراتی نے پارک کا رُخ کیا۔ وہاں چل کر سونے کی تیاری (جو کچھ بھی نہیں تھی) کرنی چاہیئے۔ اور دوسرے روز پھر اپنی قسمت کو آزمانا چاہیئے۔ مگر جب وہ سنسان سڑک پر ایک مسجد کے سامنے پہنچا تو اُس کے پاؤں نے اُسے جواب دیدیا۔ موذن خوش الحانی سے اذان دے رہا تھا اُس کی لوچدار آواز خیراتی کے کانوں میں آنے کی دیر تھی کہ اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ پھاٹک سے چمٹ گیا۔ اور کھُلے مُنہ اور دھک دھک کرتے ہوئے دل سے نماز عشاء کی اذان سننے لگا۔

زرد چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ گاڑیاں اور راہ چلتے اِکّے دُکّے تھے اور تھوڑی دیر کے لئے یہ مقام قبرستان معلوم ہوتا تھا۔ مگر صرف ایک آواز تھی جس نے خیراتی کی روح کو تڑپا دیا۔ کیونکہ ایک زمانہ تھا جبکہ اُس کی زندگی والدین اور مرادوں اور دوستوں اور پاک خیالات اور رویوں پر مشتمل تھی۔ وہ اُس آواز پر لبیک کہتے ہوئے اللہ کے گھر میں داخل ہوتا تھا۔

خیراتی کا حساس دل اُس سے حد درجہ متاثر ہوا۔ اُس کے سینہ میں ایک ہیجان عظیم برپا ہو گیا۔ دفعتہً اُسکی روح نے حیرت انگیز طور پر پلٹا کھایا۔ فوراً اُس نے ایک ناقابل بیان دہشت اور وحشت سے اُس قعر ذلت پر نظر کی جس میں وہ اوندھے منہ گر پڑا تھا۔ اُس کو اپنے بیکار ایام، اپنی متبذل خواہشات، اپنی مُردہ اُمیدوں، اپنی مجروح ذہنیت اور اپنے ذلیل خیالات سے جو اُس کی بےحیا زندگی کے رُوح رواں تھے یکلخت سخت نفرت پیدا ہو گئی۔

اِس عجیب وغریب کیفیت سے اُس کے جسم پر ایک

سنسنی پھیل گئی اور ایک لمحہ کے اندر کسی نامعلوم قوت نے اُسے اپنی تقدیر سے جنگ کرنے پر آمادہ کر دیا۔ وہ اپنے آپکو اس قعرِ ذلت سے کھینچ نکالیگا۔ وہ پھر اپنے آپ کو انسان بنائے گا۔ وہ اِس بدی پر فتح حاصل کرے گا جس نے اپنا قبضہ اُس کے اُوپر جما رکھا تھا۔ بہت وقت تھا۔ وہ نسبتاً کم عمر تھا۔ وہ اپنے پُرانے مُردہ خیالات و جذبات میں نئی رُوح پھونکدے گا۔ اور اُن پر عمل پیرا ہوگا اور اپنے قدموں کو ڈگمگانے نہ دے گا۔ بے خبر موذن کو کیا معلوم تھا کہ اُس نے اپنی اُونچی آواز میں خوش الحانی سے جو اذان دی تھی اُس نے ایک اِنسان کے اندر کتنا انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا۔ کل وہ شہر میں جائے گا اور کام کرے گا۔ بے روزگاری کے مسئلہ نے اُسے بالکل نہیں ستایا۔ ایک طوائف نے اُسکو اپنے ہاں نوکر رکھنا چاہا تھا۔ کل وہ اُس کی بارگاہ میں اپنی درخواست پیش کرے گا۔ وہ دنیا میں کسی نہ کسی مصرف کا ہوگا۔ وہ بہت جلد مسٹر خیراتی ہو جائے گا۔ وہ بہت جلد ———

خیراتی نے محسوس کیا کہ کسی نے اپنا ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھا۔ اُس نے تیزی سے مُڑکر دیکھا۔ ایک پولیس مین اُس کے روبرو تھا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟" سپاہی نے ڈانٹ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں" خیراتی نے کہا۔

"تو میرے ساتھ چلو تم آوارہ گرد معلوم ہوتے ہو۔ کانسٹبل نے کہا۔

"تین ماہ کی قید سادہ" مجسٹریٹ نے دوسرے دن پولیس کورٹ میں کہا۔

تخیّلِ مُحبّت

رابندرناتھ ٹیگور (۱۸۶۱ء-) کی پیدائش کلکتہ میں ہوئی بچپن سے ٹیگور کو شعرگوئی کا شوق رہا سنہ ۱۹۱۳ء میں گیتان جلی کی اشاعت پر "نوبل انعام" ملا۔ ڈرامہ نگاری اور افسانہ نویسی بھی شروع کی۔ اور بہت جلد ان اصناف میں کمال پیدا کر لیا۔ یہ افسانہ ان کی مخصوص طرز ادا کو کامیابی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اِس میں شعریت بہت زیادہ ہے۔ اِس لئے ہم نے ملک کے مشہور شاعر ابو محمد ثاقب کانپوری کا ترجمہ منتخب کیا ہے۔

(۱)

شاہی خزانے میں چوری ہو چکی ہے' بادشاہ کوتوال کو حکم دے رہا ہے کہ اگر چور جلد از جلد گرفتار نہ کیا گیا تو تیرا چراغِ زندگی ہمیشہ کے لئے گُل کر دیا جائے گا۔ اِس عتاب آمیز شاہی حکم کو سُنکر پہرہ داروں نے گھر گھر چور کی تلاش شروع کی۔ شہر سے دُور ایک شکستہ مندر کے کھنڈر میں ایک غریب الوطن تاجر بجر اسین بخیر سو رہا تھا۔ وہ گھوڑوں کی تجارت کیا کرتا تھا۔ اور اِسی غرض سے کاشی آیا ہُوا تھا۔ مگر تمام مال چوری جانے کی وجہ سے ناکام وطن واپس جانے والا تھا۔ کہ شاہی پہرہ داروں نے چور سمجھکر گرفتار کر لیا اور ہتھکڑی ڈالکر اُسے قید خانے کی طرف لے چلے۔

اُس وقت خوبصورت شیامہ اپنی کھڑکی میں بیٹھی ہوئی سڑک سے گزرنے والوں کی آمد و رفت کا تماشہ دیکھ دیکھ کر اپنا وقت گزار رہی تھی۔ اُسے یہ مجمع خوابیدہ مسافروں کی ایک لہر معلوم ہو رہا تھا۔

یکایک وہ اپنے اس خیال سے چونک کر کہنے لگی۔

"خدا جانے یہ خوبصورت شخص جس نے ہندر کے حسن کو بھی شکست دیدی ہے۔ بیاہی کیوں اسے اِس طرح ہتھکڑی ڈالے ہوئے لئے جا رہے ہیں"۔

یہ سوچ کر اُس نے اپنی خادمہ سے کہا "جا اور میری طرف سے کوتوال سے کہہ کہ تھوڑی دیر کے لئے میرے پاس ہوتے جائیں"۔

کوتوال جو اپنے خیالات میں محو چلا جا رہا تھا۔ لڑکی کی زبانی شیامہ کا یہ پیغام سُنکر چونک پڑا۔ اُس کے سارے جسم میں جذبات کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور فوراً قیدی کو اپنے ساتھ لئے ہوئے شیامہ کے مکان کی طرف چلدیا۔ غریب بجراسین کا چہرہ شرم و ندامت سے جھکا ہوا تھا۔

کوتوال نے مکان پر پہنچکر یوں کلام کی ابتداء کی۔ "معلوم نہیں آپ نے اِس بیوقت مجھے کیوں یاد فرمایا ہے میں سرکاری کام میں مصروف ہوں اجازت دیجئے کہ رخصت ہوں"۔

بجراسین جو ابتک شرم سے گردن جھکائے ہوئے خاموش کھڑا تھا۔ یکایک سر اُٹھا کر کہنے لگا "اے حسین عورت کیا کسی غریب الوطن اور بیگناہ مسافر کو اپنے گھر بلانے کے بعد اُس کے زخموں پر نمک چھڑکنا جائز ہے اگر نہیں تو پھر یہ کس قسم کا مذاق ہے"۔

شیامہ نے آبدیدہ ہو کر کہا "آہ اے میرے بیگناہ پردیسی یہ تمہارے ساتھ کسی قسم کا مذاق نہ تھا۔ کاش میں اپنے زیورات اور تمام روپیہ دیکر تمہارے ہاتھوں میں پڑی ہوئی ہتھکڑی خود پہن سکتی، یقین کرو کہ تمہاری اس ذلت کے احساس سے میرا دل پاش پاش ہُوا جاتا ہے"۔

شیامہ نے یہ جملہ کچھ اِس طرح ادا کیا۔ گویا وہ اپنے الفاظ اور آنسوؤں سے اُس کی ذلت کے داغوں کو دھونا چاہتی ہے۔

شیامہ نے کوتوال کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت عاجزی سے کہا۔ کہ "جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب تم لیلو اور اس غریب قیدی کو چھوڑ دو"۔ مگر کوتوال نے کہا کہ "مجھے اپنی اس مجبوری پر افسوس ہے کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کرسکتا، شاہی خزانے کی چوری نے بادشاہ کی آتشِ غضب کو مشتعل کر دیا ہے۔ جو بغیر کسی اِنسانی خون کے نہیں بجھ سکتی"۔

یہ سُنکر شیامہ سناٹے میں آگئی اور عاجزی سے کوتوال کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی "خیر اگر آپ اُس کی جان نہیں بچاسکتے تو کیا یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ صرف دو دن تک آپ اُسے قید میں رکھ سکیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میری اس آخری التجا کو رد نہ کرینگے"۔

کوتوال نے سر جھکا کر کہا۔ کہ میں آپ کے اِس حکم کی تعمیل کرونگا۔

(۲)

ایک رات گزر جانے کے بعد دوسری رات کو جب شیامہ اپنے ہاتھوں میں چراغ لئے ہوئے قید خانے میں داخل ہوئی تو اُس نے دیکھا کہ بجراسین اپنی بیگناہی کا اظہار

کر کے خدا سے تخفیف سزا کی دعائیں مانگ رہا ہے۔

شیامہ نے یہ دیکھکر محافظ کو اشارہ کیا جس نے فوراً بجر اسین کی ہتھکڑیاں کھول دیں۔

قیدی نے حیرت سے شیامہ کے خوبصورت کنول جیسے چہرے کو دیکھا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

" آہ اُس بدقسمتی کے تاریک لمحوں میں یہ کون ہے جو فرشتۂ رحمت بنکر نازل ہوا ہے۔ اے رحمدل اور میری محسن حسینہ میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن سے میں آپ کے اُس احسان کا شکریہ ادا کرسکوں۔"

"میں اور" فرشتۂ رحمت " "میں اور" رحمدل" یہ الفاظ تھے جنہیں بار بار دُھراکر وہ ہنسی اور کوٹھری قہقہوں سے لبریز ہوکر اور بھی زیادہ مُہیب معلوم ہونے لگی۔

دیوانگی اور خوف سے لبریز قہقہے اسی طرح بلند ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ آنسوؤں کے عمیق سمندر میں غرق ہوگئے۔

اُس نے اپنی آواز کو تیز کر کے کہا " ہاں ہاں مجھے معلوم ہے کہ اس عظیم الشان عمارت میں ایک پتھر بھی ایسا نہیں جو شیامہ کے دل سے زیادہ سخت ہو

یہ کہکر وہ بجر اسین کو اپنے ساتھ لئے ہوئے باہر نکل آئی۔

جنگل کے مشرقی حصے میں برنا ندی کے کنارے اشنان گھاٹ پر ایک کشتی بندھی ہوئی تھی۔ رات کی تاریکی طلوعِ سحر میں تبدیل ہو رہی تھی۔

خوبصورت عورت نے کشتی میں کھڑے ہو کر کہا۔ میرے پردیسی اور عزیز مسافر آ اور دیکھ کہ شیامہ تیرے اور صرف تیرے لئے دُنیا کے تمام مضبوط سے مضبوط رشتوں کو توڑ کر اپنی قسمت کا لنگر ایک دریا اور ایک ہی کشتی میں بیٹھ کر اُٹھا رہی ہے"

اُس کے بعد دونوں نے ملکر کشتی کو گھاٹ سے کھولدیا۔

ندی کے دونوں طرف خوبصورت پرندے نغمہ سنجی میں مصروف تھے مرد نے عورت کا سر اُٹھایا اور اپنے سینے سے لگاکر

ٹیگور

کہنے لگا " میری محسنہ مجھے بتاؤ۔ کہ میری رہائی کے لئے تم نے کس قدر کثیر رقم صرف کی ہے تاکہ مجھے معلوم ہوجائے کہ یہ بے سروسامان انسان تمہارا کس قدر رہینِ منت ہے۔"

شیامہ نے اُسے گلے لگاکر کہا۔ میرے پیارے ابھی اُس کے بتانے کا وقت نہیں آیا۔

پانی کی روانی اور ہوا کی تیزی سے کشتی سُرعت کے ساتھ ندی میں جا رہی تھی۔ آفتاب اپنی منزل طے کر چکا تھا۔ گاؤں کی لڑکیاں نہا کر اپنے گیلے کپڑوں میں لپٹی ہوئی پانی کے گگرے لیکر اپنے اپنے مکانوں کو واپس جا رہی تھیں۔ صبح کا شور و غل عرصہ ہُوا ختم ہو چکا تھا۔ دریا کے دونوں طرف کامل سکوت تھا۔ یہاں تک کہ راستے میں بھی کوئی راہگیر دکھائی نہ دیتا تھا۔

پیپل کے نیچے پتھر کا بنا ہُوا ایک مضبوط گھاٹ تھا جہاں دونوں نے نہا کر کچھ کھانے کے لئے کشتی کو ایک سہارے سے باندھ دیا۔ بڑے اُونچے اور وسیع درختوں کا سایہ متحیر و ساکت تھا۔ البتہ کبھی کبھی اس خاموش طلسم کو فاختہ کی "کوُ کوُ" توڑ دیتی تھی۔ دوپہر کی ہوا پختہ اناج کی خوشبو سے لبریز تھی کہ دفعتاً شیامہ کے چہرے پر پڑی ہوئی نقاب اُلٹ گئی۔ اور بجر اسین کے دل میں محبت کا دریا جوش مارنے لگا۔ اُس نے بھاری لیکن رُکتی ہوئی آواز میں جُھک کر کہا۔

"حقیقت میں تم نے مجھے قید کی زنجیروں سے نجات دلا کر اپنے اِحسان کی زنجیروں میں جکڑ لیا ہے۔ خُدا کے لئے مجھے ٹھیک ٹھیک بتا دو کہ تم نے مجھے اس قید کی رہائی سے کیونکر نجات دلائی ہے؟"

عورت نے شرم سے، اپنا مُنہ آنچل میں چھپا کر کہا۔

"اے میری آرزوؤں کے مرکز ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اُس کے متعلق مَیں تمہیں کچھ بتاؤں۔"

جب آفتاب کی سنہری کشتی اپنا لنگر اُٹھا مغرب کے دور و دراز ساحل پر چلی گئی تو شیامہ کی کشتی کو بھی نسیم کے جھونکوں نے ایک خوشگوار کنارے پر لگا دیا۔

(٣)

چاند مغرب کی تاریکی سے طلوع ہو رہا تھا۔ اُس کی دُھندلی روشنی خاموش پانی کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ گھنے درختوں میں چھائی ہوئی تاریکی جھینگروں کے بے پناہ شور سے بربط کے تاروں کی طرح لرز رہی تھی۔ چراغ بجھ گیا تھا۔ جنوبی ہوا تیزی کے ساتھ چل رہی تھی اور شیامہ نوجوان کے ہاتھوں پر سر رکھے ہوئے گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اُس کے حسین و مُعطر بال نوجوان کے زانو پر بکھرے ہوئے تھے۔ شیامہ نے ایک کمزور آواز میں کہا "میں نے جو کچھ تمہاری جان بچانے کیلئے کیا ہے اگرچہ وہ بہت مشکل کام تھا لیکن اُس کا تمہارے سامنے بیان کرنا اُس سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ مگر نہیں اب وقت آگیا ہے کہ میں نہایت اِختصار کے ساتھ

تمہیں اِس واقعہ کی تفصیل بتادوں۔ لیکن میری محبت کا واسطہ کہ جب تم سن چکو تو اُسے ہمیشہ کے لئے اپنے دل سے بھلا دینا۔

"رتیا جو میرے حسن کا پرستار اور میری محبت میں دیوانہ تھا اسی نے آہ اُسی نے میرے ایک اِشارے پر تمہاری چوری کا الزام اپنے سر لے لیا۔ اگرچہ یہ میری زندگی کا بدترین اور ناقابل معافی گناہ ہے۔ مگر میں خوش ہوں کہ یہ سب کچھ تمہاری حفاظت کے لئے کیا گیا ہے۔"

چاند ڈوب چکا تھا جنگل کے درخت ہزاروں پرندوں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ آخرکار بجبراسین کے وہ ہاتھ جو شیامہ کی کمر سے لپٹے ہوئے تھے۔ ڈھیلے ہونے لگے۔ اور رفتہ رفتہ ان دونوں کے درمیان ایک حدِ فاصل حائل ہوگئی۔

بجبراسین خاموش ایک گوشے میں بیٹھا ہوا تھا۔ کہ دفعتاً ایک مجروح جھینگر کی طرح شیامہ نے اپنا سر اس کے پاؤں پر رکھدیا اور گہری سیاہی تمام سطح آب پر پھیل گئی۔

بدبخت شیامہ جس کے آنسو تک خشک ہوچکے تھے۔ نوجوان بجبراسین کے پاؤں مضبوطی سے پکڑ کر کہنے لگی۔

"میرے پیارے میں نے جو کچھ تمہارے بچانے کے لئے کیا ہے۔ خدا کے لئے اسے معاف کردو۔ میں خدا کے ہاتھوں سے اس گناہ کی سخت سے سخت سزا برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر تمہارے ہاتھوں سے کسی قسم کی سختی برداشت نہیں کرسکتی۔"

بجبراسین نے اپنا پاؤں سختی کے ساتھ جھڑک کر چھڑا لیا اور غضب آلود نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔ "اے سیاہ کار عورت تجھے میری زندگی سے کیا واسطہ آہ تو نے میری زندگی کو اپنے ناپاک مقصد کے لئے خرید کر تاریک کردیا ہے۔"

رات کی تاریکی میں کشتی کسی غیر معلوم سمت کو چلی جارہی تھی۔ خشک پتے پاؤں کے نیچے دب کر کھڑکھڑا رہے تھے ہوا بند ہوگئی تھی۔ اور اونچے اونچے درختوں کے تنوں سے گویا ہزاروں وحشت ناک شکلیں تمام جنگل میں پھیلی ہوئی تھیں۔

تھکا ہوا مسافر زمین پر بیٹھ گیا۔ باوجود تاریکی اور نزاکت کے شیامہ بھی سائے کی طرح اس کے ساتھ تھی۔ جب بجبراسین نے اتنی مسافت طے کرنے کے بعد بھی اسے اپنے ساتھ ہی دیکھا تو نہایت خشمگین آواز میں چلا کر کہنے لگا۔

"اے ناپاک عورت تو اب بھی میرے ساتھ ہے"

مگر شیامہ بغیر جواب دئے ہوئے بجلی کی تیزی کی طرح اُس کے پاؤں پر گر پڑی۔

اُس کی آواز جس میں عاجزی و انکسار تھا۔ کانپ رہی تھی، وہ مجنونانہ بیخودی میں برابر کہہ رہی تھی۔ "ہاں تم مجھے مار ڈالو اور میری سیہ کاریوں کی سزا یہیں دیدو۔ مگر مجھے اپنے قدموں سے علٰحدہ کرنیکی کوشش نہ کرو۔"

جنگل کی چھائی ہوئی تاریکی جو تاروں کی روشنی سے محروم تھی یکایک کسی نامعلوم غصے سے لرزنے لگی اور درختوں کی جڑیں خوف سے زمین میں ہل گئیں کچھ دیر تک عورت کی منت اور عاجزانہ درخواست کی آوازیں آتی رہیں۔ مگر فوراً ہی ایک چیخ کے ساتھ کسی کے پتوں میں گرنے کی آواز آئی۔ اور پھر خاموشی چھاگئی۔

(۴)

جس وقت بجبر اسین جنگل سے گزر رہا تھا۔ اُس وقت طلوع سحر کی مدھم روشنی گنگا کے دوسری طرف مندر کے عکس پر پڑ رہی تھی۔ اُس نے آج کا تمام دن گنگا کے اس ریتیلے کنارے پر گزارا جہاں سُورج اپنی پُوری تیزی کے ساتھ اُس کے جسم پر چمک رہا تھا۔

گاؤں کی ایک دوشیزہ لڑکی جو پانی بھر کر واپس جا رہی تھی۔ اُس کی اُس حالت کو دیکھکر کہنے لگی۔

"شاید تم کوئی مسافر ہو۔ اگر تمہارے رہنے کی یہاں کوئی جگہ نہ ہو تو میرا گھر تمہارے لئے شوق سے حاضر ہے جہاں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ لیکن بجبر اسین نے اُس کا کوئی جواب نہ دیا۔ پیاس کی شدت سے قریب تھا کہ اُس کا دم نکل جائے۔ مگر اُس نے اِس بہتے ہوئے دریا کا ایک قطرہ بھی نہ پیا۔

جب دن ختم ہوگیا۔ تو اُس کو اپنے جسم میں بخار کی سی تپش محسوس ہونے لگی۔ اور وہ مجروح طائر کی طرح کشتی میں پڑا ہوا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ کشتی میں بستر پہ صرف ایک ہی پازیب پڑی ہوئی ہے جسے اُٹھا کر اس نے اپنے سینے سے لگالیا۔ اگرچہ اُس کی آواز تیر کی طرح اُس کے سینے سے پار ہو جاتی تھی۔

(۵)

پانچویں رات کا چاند سیتا پرنا کے درختوں سے طُلوع ہو رہا تھا اور بجبر اسین اپنے ہاتھوں کو جنگل کی طرف اُٹھائے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"آہ یہ کس حسن محبوب کا جلوہ ہے۔ جو اس جنگل کی خوفناک تاریکی میں دریا کے کنارے دکھائی دے رہا ہے آ، آ۔ اے میری محبت آ۔

ابھی وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ شیامہ دوڑتی ہوئی آئی اور اُس کے قدموں پر سر رکھ کر کہنے لگی۔

"خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ اب میں اس محبت کی کافی سزا پا چکی ہوں"۔

بجبر اسین نے مشتاق نظروں سے شیامہ کی طرف دیکھا اور وفورِ شوق سے مجبور ہو کر اُسے اپنی آغوش محبت میں لینے کے لئے ہاتھ پھیلا دئے مگر فوراً جھجک کر کہنے لگا۔

"آہ اے گزشتہ گناہوں کی یاد تو پھر یہاں رہ گئی"۔

اور یہ کہہ کر اُس نے اُس کی پازیب اپنی بغل سے نکال کر ایک بھڑکتے ہوئے شعلے کی طرح دُور پھینک دی۔ اور اپنی آنکھیں بند کر کے شیامہ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

عورت خاموش ہوگئی۔ اور دو زانو ہو کر مَرد کے پاؤں پر سر رکھ کر تیز بہنے والے دریا کے کنارے سے آہستہ آہستہ اس طرح غائب ہوگئی جس طرح یکایک آنکھ کھُل جانے کے بعد رات کی تاریکی میں خواب جذب ہو جاتا ہے۔

(ٹیگور)

حقیقت

منشی پریم چند (۱۸۸۰ء تا ۱۹۳۶ء) ملک کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کا ماحول ہندوستانی ہوتا ہے۔ اور کردار کے نشو و نما اور پلاٹ کی ترتیب میں سماج کی اصلاح پیش نظر ہوتی ہے۔ دیہاتی زندگی کی سادہ لیکن جاذب نظر منظر نگاری اور محبت کی سچی ترجمانی اُن کے افسانوں کی نمایاں خصوصیتیں ہیں جنکی وجہ سے اُن کے افسانوں کے کئی ایک مجموعے شائع ہو کر عوام و خواص میں یکساں مقبول ہوئے۔

وہ راز امرت کے دل میں سربستہ ہی رہا۔ پورنما کو اسکی نظروں سے، باتوں سے یا قیافے سے کبھی یہ وہم بھی نہ ہوا کہ امرت کو اُس سے معمولی آداب ہمسائیگی اور بچپن کی دوستی کے سوا، اور کوئی تعلق بھی ہے یا ہو سکتا ہے۔ بیشک جب وہ گھڑا لیکر کوئیں پر پانی کھینچنے جاتی تو امرت خدا جانے کہاں سے آجاتا، اور گھڑا اُس کے ہاتھ سے بزور لیکر پانی کھینچ دیتا، جب وہ اپنی گائے کو سانی دینے لگتی تو وہ اُس کے ہاتھ سے بھوسے کی ٹوکری لے لیتا، اور گائے کی ناند میں سانی ڈال دیتا، بنیئے کی دوکان پر کوئی چیز لینے جاتی تو امرت اکثر اُسے مل جاتا، اور اُس کا کام کر دیتا۔

پریم چند

پورنما کے گھر میں کوئی دوسرا لڑکا یا آدمی نہ تھا، اُس کے باپ کا کئی سال پہلے اِنتقال ہو چکا تھا، اور ماں پردے میں رہتی تھی، امرت پڑھنے جانے لگتا تو پورنما کے گھر جا کر پوچھ لیا کرتا بازار سے کچھ منگوانا تو نہیں ہے۔ اُس کے گھر میں کھیتی باڑی ہوتی تھی، گائیں بھینسیں تھیں، باغ، بغیچے تھے، گھر والوں کی نظر بچا کر وہ فصل کی چیزیں سوغات کے طور پر پورنما کے گھر دے آتا تھا۔ مگر پورنما اِن خاطر داریوں کو اُس کی شرافت اور سیر چشمی کے سوا اور کیا سمجھے اور کیوں سمجھے ایک گاؤں میں رہنے والے چاہے خونی تعلق نہ رکھتے ہوں، مگر گاؤں کے رشتہ سے بھائی بہن تو ہوتے ہی ہیں ان خاطر داریوں میں کوئی خاص بات نہ تھی۔

ایک دن پورنما نے اُس سے کہا بھی، "تم دن بھر مدرسے رہتے ہو، میرا جی گھبراتا ہے۔"

امرت نے سادگی سے کہا "کیا کروں اِمتحان قریب ہے۔"

"میں سوچا کرتی ہوں جب میں چلی جاؤں گی تو تمہیں

کیسے دیکھوں گی، اور تم کیوں میرے گھر آؤ گے۔"

اُمرت نے گھبرا کر پوچھا "کہاں چلی جاؤ گی تم؟"

پُورنما لجا گئی، پھر بولی "جہاں تمہاری بہنیں چلی گئیں جہاں سب لڑکیاں چلی جاتی ہیں۔"

اُمرت نے حسرت کے ساتھ کہا، اچھا وہ بات، اور خاموش ہو گیا، اس وقت تک یہ بات اُس کے ذہن میں نہ آئی تھی، کہ پورنما کہیں چلی بھی جائے گی، اتنی دور تک سوچنے کی اُسے مہلت ہی نہ تھی، مسرت تو حال میں ہی مست رہتی ہے۔ آیندہ کی سوچنے لگے تو مسرت ہی کیوں رہے۔

اور یہ سانحہ اُس سے جلد رونما ہو گیا، جس کا اُمرت کو گمان ہو سکتا تھا، پورنما کے لئے ایک پیغام آ گیا، متمول خاندان تھا، اور ذی عزّت، پورنما کی ماں نے اُسے بڑی خوشی سے منظور کر لیا۔ عُسرت کی اُس حالت میں اُس کی نظروں میں دُنیا کی جو چیز سب سے زیادہ عزیز تھی وہ دولت تھی اور یہاں پورنما کے لئے فارغ البال زندگی کے سارے سامان موجود تھے، اُسے جیسے منہ مانگی مُراد مل گئی، فکروں سے گھلی جاتی تھی۔ لڑکی کی شادی کا خیال آتے ہی اختلاج قلب ہونے لگتا تھا۔ گویا غیب نے اَبرو کی ایک جنبش سے اُس کی ساری فکروں اور پریشانیوں کا خاتمہ کر دیا۔

اُمرت نے سُنا تو دیوانہ ہو گیا، بے تحاشا پورنما کے گھر کی طرف دوڑا، مگر پھر لوٹ پڑا، ہوش نے پاؤں روک دئے، کیا فائدہ، اُس کی کیا خطا؟ کسی کی بھی کیا خطا؟ اسنے گھر آیا اور مُنہ ڈھانپ کر لیٹ رہا۔ پورنما چلی جائے گی، پھر وہ کیسے رہے گا، ہیجان سا ہونے لگا۔ وہ زندہ ہی کیوں رہے، زندگی ہی میں رکھا کیا ہے، مگر یہ ہیجان بھی

فرو ہوگیا۔ اور اُس کی جگہ لی اُس سکون نے جو طوفان کے بعد آتا ہے۔ وہ بے نیاز ہوگیا، جب پورنما جاتی ہی ہے تو وہ اب اُس سے کیوں کوئی تعلق رکھے۔ کیوں ملے جلے اور اَب پورنما کو اُس کی پرواہ ہی کیوں ہونے لگی، اور پرواہ تھی ہی کب، وہ خود ہی کتّوں کی طرح اُس کے پیچھے دُم ہلاتا رہتا تھا، پورنما نے تو کبھی بات بھی نہیں پوچھی، اور اَب اُسے کیوں نہ غرور ہو ایک لکھ پتی کی بیوی بننے جا رہی ہے۔ شوق سے بنے، اَمرت بھی زندہ رہے گا۔ مر نگا نہیں یہی اُس زمانہ کی رسم وفا ہے۔

مگر یہ ساری شورش دل کے اندر تھی، بے عمل، اسمیں اتنی ہمت کہاں تھی کہ جاکر پورنما کی ماں سے کہدے "پورنما میری ہے اور میری ہی رہے گی" غضب ہو جائے گا۔ گاؤں میں کہرام مچ جائے گا، ایسا واقعہ گاؤں کی روایتوں نے کبھی سُنا ہے اور نواحات نے کبھی دیکھا ہے؟

اور پورنما کا یہ حال تھا کہ دن بھر اُس کی راہ دیکھا کرتی، وہ کیوں اُس کے دروازہ سے ہوکر نکل جاتا ہے، اور اندر نہیں آتا، کبھی راستہ میں ملاقات ہو جاتی ہے تو جیسے اُس کے سائے سے بھاگتا ہے۔ وہ کلسا لیکر کنوئیں پر کھڑی رہتی ہے، کہ وہ آتا ہوگا، مگر وہ نظر نہیں آتا۔

ایک دن وہ اُس کے گھر گئی، اور اُس کے پاس جاکر جواب طلب کیا، تم آج کل آتے کیوں نہیں؟ اور اُس کا گلا بھر آیا، اُسے یاد آیا کہ اب وہ اِس گاؤں میں چند دنوں کی مہمان ہے۔

مگر اَمرت بے حس بیٹھا رہا بے اعتنائی سے صرف اِتنا بولا امتحان قریب ہے، فرصت نہیں ملتی۔ سوچتا ہوں، جب تم جا ہی رہی ہو . . . . .

وہ کہنا چاہتا تھا، تو " اب محبت کیوں بڑھاؤں "
مگر خیال آگیا کتنی احمقانہ گفتگو ہے، کوئی مریض مرنے جا رہا ہو تو کیا اس خیال سے اُس کا معالجہ چھوڑ دیا جاتا ہے، اس کے برعکس جوں جوں اُس کی حالت دگرگوں ہوتی ہے لوگ اور بھی زیادہ اِنہماک یاس کے ساتھ دوا دوش کرتے ہیں، اور نزع کی حالت میں تو جد و جہد کی انتہا ہی نہیں رہتی
گفتگو کا پہلو بدل کر بولا، سنا وہ لوگ بھی بڑے مالدار ہیں۔
پورنما نے یہ آخری الفاظ شاید سُنے ہی نہیں، یا اُن کا جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی اُس کے کانوں میں تو جواب کا پہلا ہی حصّہ گونج رہا تھا۔
دردناک لہجہ میں بولی، تو اِس میں میری کیا خطا؟ میں اپنی خوشی سے تو نہیں جا رہی ہوں۔ جانا پڑتا ہے اس لئے جا رہی ہوں۔
یہ کہتے کہتے شرم سے اُس کا چہرہ گلنار ہو گیا، جتنا اُسے کہنا چاہئے تھا، شاید اُس سے زیادہ کہہ گئی محبت میں بھی شطرنج کی سی چالیں ہوتی ہیں۔
اُمرت نے اُس کی طرف اِس طرح دیکھا، گویا تحقیق کرنا چاہتا ہے، اِن لفظوں میں کچھ معنی بھی ہیں یا نہیں، کاش اِن آنکھوں میں واریار و یکھنے کی طاقت ہوتی، اِس طرح تو سبھی لڑکیاں مایوسانہ گفتگو کرتی ہیں۔ گویا شادی ہوتے ہی اُن کی جان پر بن جائے گی، مگر سبھی ایک دن اچھے اچھے گہنے کپڑے پہن کر اور پالکی میں بیٹھکر چلی جاتی ہیں۔ اِن الفاظ سے اُس کی کچھ تشفی نہ ہوئی۔
پھر ڈرتے ڈرتے بولا، تب تمہیں میری یاد کیوں آئے گی۔
اُس کی پیشانی پر پسینہ آگیا، ایسی وحشت خیز ندامت ہوئی کہ کمرہ سے باہر بھاگ جائے، پورنما کی طرف تاکنے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔ کہیں وہ سمجھ نہ گئی ہو۔
پورنما نے سر جھکا کر جیسے اپنے دل سے کہا، تم مجھے اتنی نرموہنی سمجھتے ہو، تم جو مجھ سے بے قصور روٹھتے ہو، تمہیں اس وقت مجھ سے ہمدردی کرنی چاہئے۔ مجھے تشفی دینی چاہئے۔ اور تم مجھ سے تنے بیٹھے ہو۔ تمہیں بتاؤ میرے لئے دوسرا کون سا رستہ ہے اپنے مجھے غیروں کے گھر بھیجے دے رہے ہیں۔ وہاں مجھ پر کیا گذرے گی۔ میری کیا حالت ہوگی، یہ غم کیا میری جان لینے کے لئے کافی نہیں ہے کہ تم اِس میں اپنا غصّہ حل کر دو۔
اس کا گلا پھر بھر آیا، آج اُمرت کو اِس ملامت میں پورنما کے سوزِ نہاں کا یقین ہوا، اور اپنی کم ظرفی اور نفس پروری گویا کالکھ بن کر اُس کے چہرہ پر چمکنے لگی، پورنما کے ان الفاظ میں پوری صداقت تھی۔ اور کتنی سرزنش اور کتنا اپناپن، غیروں سے کوئی کیوں شکوہ کرے۔ بیشک اس حالت میں اسے پورنما کی دلجوئی کرنی چاہئے تھی یہ اُس کا فرض تھا، اور اُسے یہ فرض خندہ پیشانی سے پورا کرنا چاہئے تھا، پورنما نے محبت کا ایک نیا معیار اُس کے سامنے رکھدیا تھا، اور اُس کا ضمیر اس معیار سے انحراف نہ کر سکتا تھا۔ بیشک محبت ایک بے نفس قربانی ہے۔ طویل اور جگر دوز۔
اُس نے پشیمان ہو کر کہا۔ مجھے معاف کرو پورنما، میری غلطی تھی بلکہ حماقت۔

(۲)

پورنما کی شادی ہو گئی اُمرت دل و جان سے اُسکے

اہتمام میں مصروف رہا۔ دُولھا اَدھیڑ تھا۔ توندل، کُرو، اور اُس کے ساتھ ہی بڑا مغرور اور بدمزاج۔ لیکن اَمرت اِس انہماک سے اُس کی خاطرداری کر رہا تھا گویا وہ کوئی دیوتا ہے اور اُس کا ایک تبسم اُسے جنت میں پہنچا دے گا، پُورنما سے بات چیت کرنے کا اَمرت کو موقع نہ ملا اور نہ اُس نے موقع پیدا کرنے کی کوشش کی، وہ پُورنما کو جب دیکھتا روتے ہی دیکھتا اور آنکھوں کی زبان خاموش سے جتنی دلجوئی اور ہمدردی اور تشفی ممکن تھی وہ کرتا رہتا تھا۔

تیسرے دن پُورنما رو دھو کر رخصت ہو گئی، اَمرت نے اُس دن شیو مندر میں جا کر سچی عبودیت سے بھرے ہوئے دل سے دُعا کی کہ پُورنما ہمیشہ سُکھی رہے۔ غم کی تازگی میں خاسد خیالات کا کہاں گذر، غم تو روحانی امراض کا ازالہ ہے مگر دل کے اندر اُسے ایک ہمہ گیر سُونے پن اور خلا کا احساس ہو رہا تھا، گویا اب زندگی ویران ہے، اُس کا کوئی مقصد اور مُدعا نہیں۔

تین سال کے بعد پُورنما پھر میکے آئی، اُس دوران میں امرت کی بھی شادی ہو چکی تھی۔ اور وہ زندگی کا جوا گردن پر رکھے لکیر پیٹتا چلا جا رہا تھا، مگر ایک موہوم سی تمنا جس کی کوئی واضح صورت وہ نہ بنا سکتا تھا۔ تھرمامیٹر کے پارے کی طرح اُس کے اندر محفوظ تھی، پُورنما نے آکر اُس میں حرارت ڈال دی۔ اور پارہ چڑھکر سرسام کی حد تک جا پہنچا۔ اُسکی گود میں ایک دو سال کا پیارا سا بچہ تھا۔ اَمرت اس بچے کو سارے دن گلے باندھے رہتا۔ صبح و شام اُسے گود میں لیکر ٹہلانے لے جاتا، اور اُس کے لئے بازار سے طرح طرح کے کھلونے اور مٹھائیاں لاتا، صبح ہوتے ہی اُس کے ناشتہ کے لئے حلوا اور دودھ لیکر پہنچ جاتا اُسے نہلاتا، دُھلاتا، اُس کے بال صاف کرتا اُس کے پھوڑے پھنسیوں کو دھوتا، مرہم رکھتا، یہ ساری خدمت اُس نے اپنے ذمہ لے لی، بچہ بھی اُس سے اتنا ہل گیا کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اُس کا گلا نہ چھوڑتا۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اُس کے ساتھ سو جاتا اور پورنما کے آکر بلانے پر بھی اُس کے ساتھ نہ جاتا۔

اَمرت پوچھتا تم کس کے بیٹے ہو؟

بچّہ کہتا۔ تمہارے۔

اور اَمرت مسرت سے متوالا ہو کر اُسے جگر سے چمٹا لیتا۔

پُورنما کا حُسن اور بھی نکھر آیا تھا۔ کلی کھِل کر پھول ہو گئی تھی۔ اَب اُس کے مزاج میں خودداری اور تمکنت تھی اور سنگار سے عشق، طلائی زیوروں سے بجکر اور ریشمی ساڑی پہنکر اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ جاذب نظر ہو گئی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا اَمرت سے احتراز کرنا چاہتی ہے بلا کسی خاص ضرورت کے اُس سے بہت کم بولتی ہے اور وہ بھی اِس انداز سے گویا اُس پر کوئی احسان کر رہی ہو، اَمرت اُس کے بچہ پر کس قدر جان دیتا ہے۔ اور اُسکی فرمائشوں کی کتنی تندہی سے تعمیل کرتا ہے۔ بظاہر اُس کی نگاہوں میں اِن باتوں کی کوئی وقعت نہ تھی، گویا یہ اَمرت کا فرض ہے اور اُسے ادا کرنا چاہئے۔ اُس کے لئے وہ کسی شکریہ اور احسان کا حقدار نہیں۔

بچہ روتا ہے تو وہ دھمکاتی ہے، خبردار رونا نہیں، ورنہ ماموں تم سے کبھی نہ بولیں گے۔ اور بچّہ خاموش ہو جاتا ہے۔

اُسے جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اَمرت کو

بلاکر تحکمانہ انداز سے کہہ دیتی ہے اور اُمرت فوراً تعمیل کرتا ہے، گویا اُس کا غلام ہے اور وہ بھی شاید سمجھتی ہے کہ اُس نے اُمرت سے غلامی لکھالی ہے۔

چھ مہینے میکے رہ کر پُورنا سسرال چلی گئی، اُمرت اُسے پہنچانے اِسٹیشن تک آیا جب وہ گاڑی میں بیٹھ گئی تب اُمرت نے بچے کو اُس کی گود میں دے دیا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو کی بُوند ٹپک پڑی اُس نے منہ پھیر لیا، اور آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر آنسو پونچھ ڈالا۔ پُورنا کو اپنے آنسو کیسے دکھائے کیونکہ اس کی آنکھیں خشک تھیں، مگر دل نہ مانتا تھا۔ اب نہ جانے پھر کب ملاقات ہو۔

پُورنا نے تمکنت کے ساتھ کہا، بچہ کئی دن تک تمہارے لئے بہت ہڑکیگا۔

اُمرت نے بھرے ہوئے گلے سے کہا، مجھے تو عمر بھر بھی اُس کی صورت نہ بھولے گی۔

”کبھی کبھی ایک آدھ خط تو بھیج دیا کرو۔“

”بھیجوں گا۔“

”مگر میں جواب نہ دونگی یہ سمجھ لو۔“

”مت دینا میں مانگتا تو نہیں . . . . . مگر یاد رکھنا۔“

گاڑی روانہ ہو گئی۔ اُمرت اُس کی کھڑکی کی طرف تاکتا رہا۔ ایک فرلانگ کے بعد اُس نے دیکھا پورنا نے کھڑکی سے سر نکالکر اُس کی طرف دیکھا، پھر بچے کو گود میں لے کر کھڑکی سے ذرا سا دکھا دیا۔

اُمرت کا دل اس وقت اُڑ کر اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ اِتنا خوش ہے جیسے اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا ہو۔

(۴)

اسی سال پورنا کی ماں کا اِنتقال ہو گیا۔ پورنا اُس وقت زچہ خانے میں تھی، ماں کا آخری دیدار نہ کر سکی۔ اُمرت نے علاج معالجہ میں جتنی دوا دوش ہو سکی کی، کریا کرم کیا، براہمنوں کو کھلایا، برادری کی دعوت کی۔ جیسے اس کی اپنی ماں مَری ہو، اُس کے باپ اِنتقال کر چکے تھے۔ وہ اپنے گھر کا مالک تھا، کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا۔

پُورنا اب کس ناتے سے میکے آتی، اور اسے اب فرصت بھی کہاں تھی، اپنے گھر کی مالکن تھی۔ کس پر گھر چھوڑ آتی۔ اُس کے دو بچے اور بھی ہوئے، بڑا لڑکا بڑا ہوا، اور اسکول میں پڑھنے لگا، چھوٹا دیہات کے مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ اُمرت سال میں ایک بار نائی کو بھیجکر خیر سلا منگا لیا کرتا تھا۔ پورنا فارغ البال ہے، خوش ہے، اُس کی تشفی کے لئے اِتنا کافی تھا، اُمرت کے لڑکے بھی اب سیانے ہو گئے تھے، خانہ داری کی فکروں میں پریشان رہتا تھا، اور عمر بھی چالیس سے آگے نکل گئی تھی، مگر پورنا کی یاد ابھی تک اُس کے جگر کے عمیق ترین حصہ میں محفوظ تھی۔

دفعتاً ایک دن اُمرت نے سُنا کہ پُورنا کے شوہر نے دنیائے عدم کی راہ لی۔ مگر تعجب یہ تھا کہ اُسے رنج نہ ہوا، وہ خواہ مخواہ اپنے دل میں یہ طے کر بیٹھا تھا کہ اُس خبیث شوہر کے ساتھ پورنا کی زندگی قابل رشک نہیں ہو سکتی، فرض کی مجبوری اور عصمت پروری کے لحاظ سے پورنا نے کبھی اپنے سوزِ جگر کا اظہار نہ کیا۔ مگر یہ غیر ممکن ہے کہ آرام اور فارغ البالی کے باوجود اسے اِس مکروہ صورت انسان سے کوئی خاص محبت رہی ہو۔ یہ تو ہندوستان ہی ہے

جہاں ایسی اپسرائیں ایسے نااہلوں کے گلے باندھ دی جاتی ہیں، ورنہ کسی دوسرے ملک میں تو پورنما جیسی عورت پر ملک کے نوجوان نثار ہو جاتے، اس کی مری ہوئی تمنائیں پھر زندہ ہو گئیں، اب اُس میں وہ پہلے کی جھجک نہیں ہے اُس کی زبان پر نہ وہ مہر خموشی ہے۔ اور پورنما بھی اب آزاد ہے، تقاضائے سن نے یقیناً اسے زیادہ بھرپور بنا دیا ہوگا، وہ شوخی اور الھڑپن اور بے نیازی تو کب کی رخصت ہو چکی ہوگی، اِس دوشیزگی کی جگہ اب آزمودہ کار نسائیت ہوگی جو محبت کی قدر کرتی ہے۔ اور اس کی طلبگار ہوتی ہے۔ وہ پورنما کے گھر ماتم پرسی کرنے جائے گا، اور اُسے اپنے ساتھ لائے گا۔ اور اُس کے اسکان میں اُس کی جو کچھ خدمت ہو سکے گی وہ کرے گا۔ اب اُسے پورنما کے محض قرب سے تشفی ہو جائے گی، وہ محض اُس کے منہ سے یہ سُنکر روحانی تشفی پائے گا کہ وہ اب بھی اُسے یاد کرتی ہے۔ اب بھی اُس سے وہی بچپن کی سی محبت کرتی ہے۔ بیس سال پہلے اُس نے پورنما کی جو صورت دیکھی تھی، وہ بھرا ہوا جسم، وہ رخساروں کی سُرخی، وہ ملاحت، وہ اِس کی کھچی ہوئی ٹھڈی۔ جس میں اُمرت سے بھرا ہوا حوض تھا، وہ اُس کی نشہ خیز مسکراہٹ وہی صورت بہت خفیف تغیر کے ساتھ ابھی تک اُس کی آنکھوں میں تھی، اور وہ تغیر تخیل کی آنکھوں میں اب اُسے اور بھی خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔ مرورِ زمانہ کی بیداریوں کا اُسکے اُوپر کچھ نہ کچھ اثر ہوگا۔ لیکن پورنما کے جسم میں کسی ایسی تبدیلی کا وہ گمان بھی نہ کر سکتا تھا، جس سے اُس کی دلفریبی میں فرق آجائے اور اب وہ ظاہر کا اِتنا گرویدہ بھی نہ تھا، جتنا اُس کی سنہاسنے شیرینی کا، اُس کی نگاہِ محبت کا اُس کے اعتماد کا۔ وہ فردانہ خود پروری کے زعم میں شاید یہ بھی سمجھتا تھا کہ وہ پورنما کے نا آسودہ ذوقِ محبت کو اپنی ناز برداریوں اور گرمجوشیوں سے محفوظ کرے گا۔ اور اپنی پچھلی فروگذاشتوں کی تلافی کر دے گا۔

حسنِ اتفاق سے ایک دن پورنما خود اپنے چھوٹے لڑکے کے ساتھ اپنے گھر آگئی، اُس کی ایک بیوہ موسی جو اُس کی ماں کے ساتھ ہی اپنی بیوگی کے دن کاٹ رہی تھی ابھی موجود تھی، وہ سونا گھر آباد ہو گیا۔

اُمرت نے اُس کی خبر سُنی تو اشتیاق سے مخمور ہو کر دوڑا، بچپن اور شباب کی شیریں اور پُر حسرت اور پُر شوق یادگاروں کو دل کے دامن میں سنبھالتا ہوا، جیسے کوئی بچہ اپنے ہمجولی کو دیکھکر اپنے ٹوٹے پھوٹے کھلونے لیکر دوڑے۔

مگر اُس کی صورت دیکھتے ہی اُس کا اِشتیاق اور ولولہ جیسے بجھ گیا، سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا، پورنما اُس کے سامنے آکر سر جھکا کر کھڑی ہو گئی، سفید ساڑی کے گھونگھٹ سے آدھا منہ چھپا ہوا تھا۔ کمر کمر جھک گئی تھی۔ باہیں سوت سی پتلی۔ پشت پا کی رگیں اُبھری ہوئی، آنکھوں سے آنسو جاری اور رخسارے زرد۔ جیسے کفن میں لپٹی ہوئی لاش کھڑی ہو۔

پورنما کی موسی نے آکر کہا۔ بیٹھو بیٹا۔ دیکھتے ہو اس کی حالت۔ سوکھکر کانٹا ہو گئی ہے۔ ایک چھن کو بھی آنسو نہیں تھمتے، صرف ایک وقت سوکھی روٹیاں کھاتی ہے، اور کسی چیز سے مطلب نہیں، نمک چھوڑ دیا ہے، گھی، دودھ سب تیاگ دیا، بس روکھی روٹیوں سے کام، اس پر آئے دن برت رکھتی ہے، کبھی ایکادشی، کبھی اتوار کبھی منگل، زمین پر سوتی ہے، ایک چٹائی بچھا کر، گھڑی رات سے پوجا پاٹ کرنے لگتی ہے۔ لڑکے سمجھاتے ہیں، مگر کسی کی نہیں سنتی، کہتی ہے جب بھگوان نے سہاگ ہی اُٹھا لیا

توسب کچھ متھیا (باطل) ہے۔ جی بہلانے کے لئے یہاں آئی تھی، مگر یہاں بھی رونے کے سوا دوسرا کام نہیں، کتنا سمجھاتی ہوں بیٹی بھاگ میں جو کچھ لکھا تھا، وہ ہوا، اب صبر سے کام لو، بھگوان نے تمہیں بال بچے دئے ہیں۔ اُن کو پالو، گھر میں بھگوان کا دیا سب کچھ ہے، چار کو کھلا کر کھا سکتی ہو۔ من پوتر چاہیئے، بدن کو دُکھ دینے سے کیا فائدہ مگر سنتی ہی نہیں، تم سمجھاؤ تو شاید مانے۔

اور اَمرت بظاہر بے حس اور باطن میں روح فرسا کھڑا تھا۔ گویا جس بنیاد پر زندگی کی عمارت کھڑی کی تھی، وہ ہل گئی ہو۔ آج اُسے معلوم ہوا کہ زندگی بھر اُس نے جس چیز کو حقیقت سمجھا تھا، وہ محض سراب تھا، محض خواب نفس کی اُس کامل تسخیر اور عمل کے اُس زاہدانہ اجتہاد میں اُس کی وہ پُرارمان اور پُراشتیاق محبت فنا ہوگئی۔ اور اُس کے سامنے یہ نئی حقیقت جلوہ افروز ہوئی کہ دل میں اگر مٹی کو دیوتا بنانے کی قدرت ہے تو اِنسان کو دیوتا بنانے کی بھی قدرت ہے، پورنما اِسی طرح وہ اِنسان کو دیوتا بنا کر اُس کی پرستش کر رہی تھی۔

اُس نے احترام کے لہجہ میں کہا، تپسوِنی کو ہم جیسے غرض کے بندے کیا سمجھ سکتے ہیں۔ موسی ہمارا فرض اُس کے قدموں پر سر جھکانا ہے، سمجھانا نہیں۔

اور پورنما نے منہ پر کا گھونگھٹ ہٹاتے ہوئے کہا، تمہارا بچہ ابھی تک تمہیں پوچھا کرتا ہے۔

گودی[۱]

موری اوگوائی (۱۸۶۰ تا ۱۹۲۲ء) اوگوائی فوج کا ناظم طبابت تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ قابل قدر ادیب بھی تھا۔ ترجموں اور توضیحوں میں اُس نے انتھک محنت کی۔ موجودہ یورپی مصنفین کے شہ کاروں کا جو ترجمہ اُس نے جاپانی زبان میں کیا ہے بہترین ہے۔ نفیس مختصر قصوں کے علاوہ اُس نے اہم سوانح عمریاں، اور ناول بھی لکھے۔ یہ تورآؤتا کی تومو کے انگریزی ترجمے سے اُردو میں منتقل کیا جارہا ہے۔

یہ ترجمہ رسالہ ادبی دنیا کے مدیر اور "دنیا کے بہترین افسانے" کے مولف مولوی منصور احمد صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔

گودی طویل ہے ——— بہت طویل ——— گاڑی کی پٹڑی کی چار لائنیں آہنی پل کے شہتیروں کو سیدھی اور ترچھی کاٹتی ہوئی اِس طرح گذرتی ہیں کہ چھوٹی بڑی گیلیوں سے بچوں کی جل ترنگ کی سی شکل بن گئی ہے۔ کڑیوں کی درزوں میں جوتوں اور کھڑاؤں کی ایڑیاں پھنس پھنس کر رہ جاتی ہیں۔ سورج کی کرنیں اُن درزوں

---

[۱] لوہے یا لکڑی کی وہ تعمیر جو نیچے سے کھلی ہوتی ہے اور خشکی سے جہاز تک پہنچتی ہے۔

میں سے چھن چھن کر سمندر کی تاریک لہروں پر چمک رہی ہیں۔

آسمان صاف اور گہرا نیلا نظر آ رہا ہے۔ گاڑی کے ڈبے میں جہاں وہ اپنے آج ہی رخصت ہو جانے والے خاوند کے ساتھ بیٹھی تھی اُسے خیال تک نہ تھا کہ باہر تیز ہوا چل رہی ہے۔

جن رکشا سے نکل کر جس میں وہ یوکوہاما کے سٹیشن پر سوار ہوئی اور اُس گودی پر کھڑے ہو کر اُسے معلوم ہوا کہ مارچ کی پانچویں تاریخ کی ہوا ابھی تک بدن کو کاٹتی ہوئی اور اُس کے ازوما فرغل کے دامن کو اڑاتی ہوئی چل رہی ہے۔

ایک ڈھیلا ڈھالا سیم رنگ ازوما فرغل اُس کے بدن کو ڈھانپ رہا ہے، وہ بدن جو اُس کے آج ہی سفر پر روانہ ہو جانے والے خاوند کے بچے کے کا حامل ہے آج، وہ دن جو اُس کے خلوت گزینی کے مہینے سے بہت قریب ہے اُس کے بال سوکوہٹسو میں چھپے ہوئے ہیں اور اُس کا گلوبند سفید ریشم کا ہے۔ وہ ہلکے سبز رنگ کی پھندنے دار چھتری لئے ہوئے اپنی چار پانچ خادماؤں میں گھری ہوئی چلی جا رہی ہے۔

گودی طویل ہے ـــــ بہت طویل ـــــ

بڑے بڑے جہاز گودی کے دائیں اور بائیں لنگر انداز ہو رہے ہیں۔ جن میں سے بعض پر سیاہ اور بعض پر سفید روغن کیا گیا ہے۔ یہ جہاز ہوا کے لئے روک بن گئے ہیں۔ جب کبھی وہ جہازوں کے درمیانی خلا کے پاس سے گذرتی ہے، ہوا کا ایک تیز جھونکا اُسکے ازوما فرغل کے دامن اڑانا شروع کر دیتا ہے۔

دو سال ہوئے اُس کے رئیس شوہر نے یونیورسٹی سے ادب کی اعلیٰ سند حاصل کرنے کے فوراً ہی بعد اُس سے شادی کی تھی۔ پچھلے سال اُس کا پہلا بچہ پیدا ہوا تھا۔ ایک ہیرے جیسی خوبصورت شہزادی۔ سال کے آخر میں اُس کا خاوند شاہی دربار میں حاکمِ دستور مقرر ہوا اور اب وہ سرکاری کام پر لندن جا رہا ہے۔

بھورے رنگ کا نیا اوورکوٹ پہنے اور خمدار دستے والا بید گھماتے ہوئے اُس کا شوہر گودی سے جلد جلد گزر رہا ہے۔ اُس کا نائب بھی جو اُس کے ہمراہ جا رہا ہے اور جس کا سر اُس کے قد سے نکلتا ہوا ہے اُسی قسم کا لباس پہنے اُس کے پہلو پر تیز تیز چل رہا ہے۔

وہ فرانسیسی جہاز جس پر اُس کا شوہر سفر کرنے والا ہے گودی کے انتہائی سرے پر دائیں جانب ٹھیرا ہوا ہے۔

ایک بلند سی چوکی گودی پر بنی ہے۔ اِس چوکی کو ایک تختے کے ذریعہ سے جہاز کے ساتھ ملایا گیا ہے۔

وہ اُن کے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ چلی جا رہی ہے اُس کا شوہر اور شوہر کا رفیق سفر اب تختے کو طے کر کے جہاز میں داخل ہو رہے ہیں۔

بہت سے لوگ جن کی نظریں اُنہیں کی جانب اُٹھ رہی ہیں گودی پر جا بجا کھڑے ہیں۔ تقریباً یہ سب کے سب وہ لوگ ہیں جو اُس کے شوہر اور اُس کے نائب کو الوداع کہنے آئے ہیں۔ شاید اس جہاز میں سفر کرنے والے لوگوں میں اتنی اہم شخصیت اور کسی کی نہیں ہے اور نہ کسی اور کی طرف اتنی آنکھیں لگ رہی ہیں۔

بعض لوگ اس بلند سی چوکی کے پاس جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنے رفقا، کا انتظار کرتے ہیں۔ بعض

اس جگہ کھڑے ہیں جو چوکی کے ذرا سامنے واقع ہے اور جہاں رسّے اور میخیں پڑی ہیں۔

اِن لوگوں میں وہ بھی ہیں جن سے اُس کے شوہر کے بڑے اچھے مراسم ہیں، اور وہ بھی ہیں جن کو اُس سے تھوڑی بہت شناسائی ہے۔ لیکن اِس صاف اور روشن فضا میں اُن کے چہرے مُرجھائے ہوئے سے کیوں ہیں۔ یا یہ صرف اُس کی بیوی کا اپنا خیال ہے۔

گودی طویل ہے ------ بہت طویل ------

آہستہ آہستہ اُن کے پیچھے جاتے ہوئے اچانک اُس کی نگاہ دائیں طرف اُٹھ جاتی ہے۔ جہاں جہاز کی بہت سی گول گول کھڑکیاں نظر آرہی ہیں ایک کھڑکی میں سے کچھ عورتوں کے چہرے اور سینے نظر آرہے ہیں۔ تین اُن میں سے تیس سے چالیس برس کی عمر کی ہیں، اور سب کے سینے سفید کپڑے سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ یہ ضرور جہاز کی خادمائیں ہونگی۔ یہ اُس جہاز کی خادمائیں ہیں جس پر اُس کا شوہر سفر کر رہا ہے، اِس خیال سے اُن ادنیٰ درجے کی عورتوں پر بھی اسے رشک ہوتا ہے۔

ایک عورت جہاز کے کنارے پر کھڑی گودی کی طرف دیکھ رہی ہے اُس نے ایک بڑی سی ٹوپی پہن رکھی ہے جس پر سفید کپڑے کا ٹکڑا ہے اور اُس کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک چھوٹا سا بیگ ہے۔ اُس کی خمدار ناک کے اُوپر اور شکن در شکن چہرے میں دو چمکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں ہیں جو کسی تصویر میں سیاہی کے دو دھبوں کی طرح نظر آرہی ہیں۔ وہ کوئی یہودن معلوم ہوتی ہے۔ وہ بھی غالباً کوئی مسافر ہے جو اسی جہاز پر کہیں جا رہی ہے۔ اُس پر بھی اُسے رشک ہوتا ہے۔

گودی طویل ہے ------ بہت طویل ------

آخر کار وہ بھی تختے کے قریب پہنچ جاتی ہے وہ بڑی احتیاط سے اپنے جسم کو لے جارہی ہے جو ازوما فرغل کے نیچے اُس کے شوہر کے دوسرے بچے کا حامل ہے اور وہ اُس بڑے سیاہ جہاز کے عرشے پر اُترتی ہے۔ وہ اپنی چھتری ایک خادمہ کے ہاتھ میں دے دیتی ہے۔ اُن لوگوں کے ساتھ جو الوداع کہنے آئے ہیں اور جو پہلے ہی سے عرشے پر موجود ہیں وہ جہاز کے کنارے کنارے چل کر اُس کی پیشانی کی طرف پہنچتی ہے۔ راستے کے خاتمے پر مسافروں کے کمرے واقع ہیں، جن کی تعداد ستائیس سے بڑھ کر اب انتیس ہو چکی ہے۔

اُس کے شوہر کا نائب دروازے پر کھڑا ہے اور اُس سے کہتا ہے "یہ کمرہ ہے محترم خاتون"
وہ کمرے میں نظر ڈالتی ہے تو اُسے دو پلنگ

منصور احمد

نظر آتے ہیں جن کے نیچے وہ صندوق اور اسباب پڑا ہے جس سے اُس کی نظریں خوب آشنا ہیں۔ ایک پلنگ کے سامنے اُس کا شوہر کھڑا ہے۔

"دیکھ لو، محترم خاتون، اس طرح کا کمرہ ہے۔"

ہاں، اِس کمرے کا اسے اچھی طرح معائنہ کرنا چاہئیے۔ اُس کے شوہر کے طویل سفر میں یہی کمرہ ہے جہاں اُس کے خواب آیا جایا کریں گے۔

ایک شخص جو بظاہر کپتان معلوم ہوتا ہے آکر اُس کے شوہر سے فرانسیسی زبان میں مخاطب ہوتا ہے اور اُسے جہاز کے سیلون کی طرف لے جاتا ہے وہ بھی اپنے شوہر اور اُس کے نائب کے پیچھے پیچھے جاتی ہے اور کمرے میں داخل ہو جاتی ہے۔

یہ ایک وسیع اور خوبصورت کمرہ ہے۔ جا بجا میزیں لگائی گئی ہیں، اور ہر میز پر پھولوں کی ایک ٹوکری رکھی ہے . . . . . . رفتہ رفتہ وہ سب لوگ جو الوداع کہنے آئے ہیں کمرے میں جمع ہو جاتے ہیں۔

اُس شخص کے حکم سے جو بظاہر کپتان معلوم ہوتا ہے ایک خادم گلابی رنگ کی بہت سی پیالیاں لے کر آتا ہے، اور اُن میں شمپین ڈال کر تمام لوگوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ایک اور خادم اِس قسم کے کیک ایک رکابی میں رکھ کر لاتا ہے جیسے ملائی کی برف کے ساتھ دئے جاتے ہیں اور اُن کو سب لوگوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

لوگ پیالے لے کر کے بعد دیگرے چلے جاتے ہیں اور اُس کے شوہر اور شوہر کے رفیق سفر کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر "یہ سفر تمہیں مبارک ہو" کہہ کر چڑھا جاتے ہیں۔

میز کے پاس ایک چھوٹی سی کرسی پر بیٹھی ہوئی وہ اُس وقت کا انتظار کر رہی ہے جب مبارکبادوں کا سلسلہ ختم ہو۔ اِن مصروف لمحوں میں کبھی کبھی اُس کا شوہر آنکھ اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھ لیتا ہے۔

لیکن اتنے لوگوں کے سامنے وہ اُس سے اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اور وہ بھی اتنے لوگوں کے سامنے کون سی بات ہے جو کہہ سکتی ہے۔

گھنٹی بجتی ہے۔ اُس کے شوہر اور اُس کے ہم سفر کو لوگ الوداع کہہ کر ایک ایک کر کے باہر نکل رہے ہیں وہ بھی اپنے شوہر اور اُس کے رفیق کو سلام کر کے لوگوں کے پیچھے پیچھے چلی آتی ہے اب پھر خطرناک تختے سے گزر کر وہ گودی پر آتی ہے۔ خادمہ سے اپنی ہلکی سبز رنگ کی چھتری لے لیتی ہے اور اُسے کھول لیتی ہے۔

اُس کا شوہر اور شوہر کا ہم سفر جہاز پر کھڑے اُس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وہ بھی اپنی چھتری کے نیچے سے اُن کی طرف دیکھ رہی ہے۔ جب وہ اُوپر کو تکتی ہے تو اُسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُس کی آنکھیں بڑی ہوتی جا رہی ہیں۔

پھر گھنٹی بجتی ہے۔ چند فرانسیسی ملاح تختے سے رسی باندھ رہے ہیں۔ ایک جاپانی مزدور اُس اونچی سی چوکی پر کھڑا ہے اور تختے کو چوکی پر سے اُتارنے کی تیاری کر رہا ہے۔ اُس رسی سے لٹک کر جسے جاپانی مزدور کھینچ رہا ہے آخر تختہ جہاز سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔

شہر یوکوہاما کی دوپہر کی توپ گونجتی ہے۔ اِس کے ساتھ ہی جہاز جس کے پیٹ میں سے کچھ دیر سے

ایک شورِ عظیم اُٹھ رہا تھا خاموشی سے حرکت کرنے لگتا ہے۔

دو بوڑھے یورپین جو میاں بیوی معلوم ہوتے ہیں جہاز کی حد کے قریب کھڑے ہیں۔ وہ اُس سفید مُو آدمی سے کوئی خوش آیند بات کر رہے ہیں جو گودی پر کھڑا ہے اور جس کا ایک پاؤں اس آلہ پر ہے جس سے رسّی لپیٹی جاتی ہے۔ اُنہیں جدائی کا کوئی غم معلوم نہیں ہوتا۔

یوں معلوم ہوتا ہے جیسے جہاز حرکت کر رہا ہے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے گودی حرکت کر رہی ہے۔ وہ مقام جہاں اُس کا شوہر کھڑا ہے اُس مقام سے جہاں وہ کھڑی ہے اُسے دُور بہت دُور معلوم ہو رہا ہے۔ اُسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُس کی آنکھیں بڑی ہوتی جا رہی ہیں۔

جو لوگ اُنہیں رخصت کرنے آئے تھے اُن میں سے بعض کچھ دیر اور اُن سے قریب رہنے کے لئے دوڑ دوڑ کر گودی کے کنارے کی طرف جا رہے ہیں۔ مگر وہ ایسی خلافِ حیا حرکت نہیں کر سکتی یکایک کوئی سفید سی چیز جہاز سے لہراتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ایک رومال تھا اور اُسے وہی عورت ہلا رہی تھی جس نے سفید پٹکے سے سجی ہوئی بڑی سی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ ایک لمبا آدمی گودی کے کنارے پر کھڑا ہے۔ اس نے سرخ واسکٹ اور کمائے ہوئے چمڑے کی جوتی پہن رکھی ہے۔ وہ بھی ایک سفید رومال ہلا رہا ہے۔ غالباً یہ بھی متاہل زندگی کی جدائی ہی کا ایک نظارہ ہے۔

اِن دونوں کی طرف دیکھ کر اب ہر طرف سے رومال ہل رہے ہیں۔ جو لوگ اُس کے رئیس شوہر کو رخصت کرنے آئے ہیں وہ بھی سفید رومال ہلا رہے ہیں۔ اُس کے پاس بھی اپنا باریک رومال ہے جسے وہ اپنی آستین میں ڈال کر لائی ہے، لیکن وہ یہ خلافِ حیا حرکت نہیں کر سکتی۔

جہاز نے گودی کی حدود سے نکل کر اپنا رُخ ذرا دائیں طرف مُوڑا۔ وہ جگہ جہاں اُس کا شوہر اور شوہر کا رفیق سفر کھڑے تھے آخر اب نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے۔ پھر بھی اسے دنبالۂ جہاز پر پندرہ یا سولہ سال کا ایک لڑکا نیلا لباس پہنے نظر آ رہا ہے۔ آہ، فرانس میں وہ کون سی ماں کی آنکھوں کو روشن کرنے جا رہا ہے؟ یا اُس کے ماں باپ موجود ہی نہیں؟ وہ یہاں کھڑا کس چیز کی طرف دیکھ رہا ہے؟

آہستہ سے وہ مڑی اور اپنی خادماؤں سمیت چل پڑی۔

گودی طویل ہے ــــــ بہت طویل ــــــ

اُس جگہ جہاں ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی سیاہ رنگ جہاز کھڑا تھا زرد دُھوپ کی شعاع پڑ رہی ہے اور پانی فلوس ماہی کی طرح چمک رہا ہے۔

ہوائی جنگ

ہوائی جنگ بالکل حالیہ چیز ہے۔ کیونکہ خود پرواز کے مسئلہ کو حل ہوئے ابھی پورے پچاس سال بھی نہیں ہوئے۔ لیکن لاسلکی پیام رسانی کی طرح فن پرواز میں اس کی افادیت کے باعث دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی اور آج طیاروں کی کارکردگی کا جو عالم ہے اس کا بیان تحصیل حاصل ہے۔ پرواز کے مسئلہ کے حل کی حقیقی اہمیت جنگِ عظیم میں ظاہر ہوئی۔ گو جنگ عظیم کے زمانے میں طیارے بہت ہی ابتدائی حالت میں تھے، نہ تو ان کے عمل کا دائرہ اتنا وسیع اور نہ ان کی صلاحیت کار قابلِ اعتماد تھی تاہم جنگِ عظیم میں ان کی مدد سے دشمن کے علاقوں کا حال معلوم کرنے اور ان پر معمولی بم گرانے کا کام لیا گیا۔ اسی زمانے میں نکتہ رس دماغوں نے تاڑ لیا کہ طیارے ایک دن لڑائی کا سب سے بڑا حربہ ثابت ہو کر رہیں گے اور مستقبل کی جنگ زیادہ تر ہوائی جنگ ہوگی۔ چنانچہ اس رجحان اور اس محرکہ کے باعث طیاروں کی ساخت میں مختلف ممالک نے گہری دلچسپی لینی شروع کی اور خصوصیت کے ساتھ ان کی جسامت اور رفتار کی زیادتی کی طرف توجہ مبذول کی گئی۔ اور ان کے زمانہ میں چند ہی سالوں میں اتنی ترقی ہو گئی کہ دنیا کی اس گوشہ سے لے کر اس گوشہ تک ہوائی سروسوں کا جال پھیلا دیا گیا۔ اور ہر قسم کے بڑے اور چھوٹے طیارے بنائے گئے۔ اس خصوص میں امریکہ، برطانیہ روس اور جرمنی کی کوششیں قابل لحاظ ہیں۔

امن کے زمانہ میں تو ہر طرح کے سفری طیارے بنائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ جنگی طیارے بھی تیار ہوتے رہے اور ہوائی لڑائی کے نقطۂ نظر سے، مختلف کاموں کے لیے مختلف نمونوں کے طیارے بنائے جانے لگے۔ چنانچہ کارکردگی اور ساخت کے اعتبار سے جنگی طیارے بھی اتنا ہی متنوع ہیں جتنے کہ جنگی جہاز۔ ذیل میں ان کی بڑی تقسیم درج ہے:-

(۱) لڑاکہ طیارے

(۲) مشقی طیارے

(۳) مواصلتی اور فوج بردار طیارے۔

(۴) قراولی طیارے

(۵) بحری طیارے۔

(۶) بمبار طیارے۔

(۷) غوطہ زن بمبار طیارے

اب ہم ان جنگی طیاروں کی کسی قدر تفصیل پیش کریں گے۔

۱۔ جنگی طیاروں کے اقسام

لڑاکا طیارے لڑاکہ طیارے فضائی جنگ کا زبردست حربہ ہیں۔ ان کی ساخت دوسرے

طیاروں سے جدا ہوتی ہے۔ اِن طیاروں کے بازوؤں میں کسی قدر اُبھار ہوتا ہے۔ یہ بازو طیارے کے جسم کے نیچے ہوتے ہیں۔ اُن میں ایک اِنجن ہوتا ہے۔ حالیہ جنگ میں اِن طیاروں کی ساخت میں نمایاں تبدیلی کی جا کر اُن کی کارکردگی میں بہت ہی اِضافہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ پچھلی جنگ میں لڑاکہ طیاروں کی اِنتہائی رفتار ۳۰۰ میل فی گھنٹہ تھی لیکن آج یہی طیارے چار سو میل کی رفتار سے بڑے مزے میں پرواز کرتے ہیں۔ پہلے اُن کی پرواز کی حد ۱۵۰۰۰ فٹ تھی اور آج یہ ۲۵ ہزار فٹ سے بھی زیادہ بلندی پر اُڑتے ہیں اِسی طرح پہلے اُن کے میدانِ عمل کا دائرہ کم و بیش ایک سو میل تھا لیکن آج یہ چار چھ سو میل تک اپنی جولانیاں دکھلا سکتے ہیں۔

لڑاکہ طیارے مختلف قسم کے

خاص خاص اِسلحہ سے مسلح ہوتے ہیں۔ اُن پر بالعموم چھوٹی نالی کی نو توپیں نصب کی جاتی ہے۔ ہر بازو میں چار چار اور پروپلر کے اُوپر ایک۔ یہ نو توپیں ایک ساتھ چل سکتی ہیں۔ اُن کے چلانے کا تعلق ایک کھٹکے سے ہوتا ہے۔ جیسے ہی طیارچی نے کھٹکا دبایا یہ تمام توپیں چلنے لگیں۔ اِس طرح طیارے سے گویا گولیوں کی ایک چادر نکلتی ہے اِن کے علاوہ لڑاکہ طیارے پر دو بڑی اور دو چھوٹی یعنی سب مشین گن چڑھی ہوتی ہیں۔ ہر مشین گن اِس طرح نصب ہوتی ہے کہ اپنے مرکز کے گرد چوطرف گھوم سکے اِس ترتیب سے نشانہ لینے میں سہولت ہوتی ہے۔

اِن طیاروں کا کام دو قسم کا ہوتا ہے۔ (۱) وزنی بمباروں کی ہمراہی اور (۲) دشمن کے بمباروں کے ساتھ جو لڑاکہ طیارے ہوتے ہیں، اُن سے نبرد آزمائی کرنا۔ ہوتا یہ ہے کہ جب وزنی بمبار فوجی چھاؤنیوں یا ہوائی اڈوں پر بمباری کی غرض سے جاتے ہیں تو اس کے لیے ایک نہیں بلکہ عام طور پر تین وزنی بمبار روانہ کئے جاتے ہیں۔ اُن کی ہمراہی میں نو لڑاکہ طیارے ہوتے ہیں۔ اُن کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ دشمن کے اُن لڑاکہ طیاروں سے نبٹ لیں جو اُن بمباروں پر حملہ آور ہوں پرواز اور عمل کے دوران میں لڑاکہ طیارے بمباروں کے اطراف رہتے ہیں (بازو کی شکل ملاحظہ ہو)۔ دوسرا کام یہ ہے کہ یہ لڑاکہ طیارے آگے بڑھ کر دشمن کے بمبار کے ساتھ والے لڑاکہ طیاروں سے جنگ کریں تاکہ ایک تو اُن کے بمبار کے آگے نہ بڑھ سکیں اور دوسرے اِن کے بمبار محفوظ رہ سکیں۔

اِن دونوں فرائض سے قطع نظر لڑاکہ طیارے ایک اور کام بھی انجام دیتے ہیں۔ وہ یہ کہ دورانِ پرواز میں جب وہ کسی فوجی مقام کو غیر محفوظ پاتے ہیں تو کم بلندی تک اُتر کر اپنی مشین گنوں سے حملہ کرتے ہیں۔

لڑاکہ طیاروں کے بعض اہم اقسام یہ ہیں:—

اِسپٹ فائر، ہنیکل، ہریکن، مسرشمٹ، ڈیفائنٹ۔

مشقی طیارے

ہوائی لڑائی میں کامیابی کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہوا باز یا طیارچی اپنے کام میں مشاق ہو۔ اِس لیے ہوائی طاقت کے لیے قابل اور اہل ہوا بازہی درکار ہیں۔ اِس غرض کے لیے اہل اشخاص کو پرواز اور جنگ کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ اِس سلسلہ میں جو طیارے استعمال کیے جاتے ہیں انھیں مشقی طیارے کہتے ہیں۔ یہ طیارے جنگی طیاروں سے مِلتے جُلتے ہوتے ہیں مگر نسبتاً چھوٹے ہوتے ہیں۔ ایک اور بات یہ ہے کہ اُن مشقی طیاروں کو ان تمام نمونوں پر بنایا جاتا ہے، جو جنگی طیارے کہلاتے ہیں کیونکہ جنگی طیاروں کی میکانیت اِس قدر اہم اور متنوع ہوتی ہے کہ ایک خاص نمونے کے طیارے پر مشق کرنے کے بعد یہ ضروری نہیں کہ وہ شخص دوسرے ہر قسم کے جنگی طیارے پر کام کرسکے۔ اِس لیے جس شخص سے جس قسم کا کام لینا ہوتا ہے اسی سے اُسی پر مشق کروائی جاتی ہے۔ اِن طیاروں میں تین نشستوں کا انتظام ہوتا ہے۔ نوآموزوں کے لیے اور ایک معلم کیلئے

مواصلتی اور فوج بردار طیارے

یہ طیارے جیسا کہ اُن کے کام کی نوعیت سے ظاہر ہے، کافی بڑے ہوتے ہیں یوں تو بڑے طیاروں میں بمبار بھی شامل ہے لیکن یہ اُس سے بھی کہیں بڑے ہوتے ہیں اُن میں سپاہیوں کی کافی تعداد ہوتی ہے اور کثیر مقدار میں سامانِ رسد رکھا جاسکتا ہے۔ اِن طیاروں پر بالعموم اسلحہ نہیں ہوتے البتہ لڑاکہ طیاروں کی ایک ٹکڑی اُن کی معیت میں ہوتی ہے تاکہ اگر دشمن کے طیارے اُس پر حملہ کریں تو وہ نبٹ لے سکے۔ اِن طیاروں سے خاص طور پر دو کام لیے جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ بعید فاصلوں کے محاذ پر فوری کمک روانہ کی جاسکتی ہے اور دوسرے دشمن کے محاذ کو عبور کرکے، محاذ کے پیچھے فوج اُتاری جاسکتی ہے تاکہ آگے اور پیچھے سے حملہ ہونے کی وجہ سے دُشمن پریشان ہوجائے۔ ساتھ ہی اُس کے اُن طیاروں کے ذریعہ محاذ پر ہر قسم کا سامانِ رسد آسانی اور عجلت کے ساتھ بھیجا جاسکتا ہے۔

قراولی طیارے

قراولی جہاز کی نوعیت دوسرے جنگی طیاروں سے مختلف ہوتی ہے۔ اُن کے کام کی نوعیت کے لحاظ سے، اُن پر اسلحہ کا ہونا ضروری نہیں، اِس لیے اُن کے ساتھ اسلحہ نہیں ہوتا البتہ ان میں اعلیٰ درجہ کے حسّاس کیمرے اور طاقتور دُوربینیں ہوتی ہیں تاکہ دور سے دشمن کی نقل و حرکت کو دیکھ سکیں اور کیمروں سے اچھی اور واضح تصویر لے سکیں۔ اِن طیاروں کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے اور یہ کوئی ۲۱۰ میل کی انتہائی رفتار رکھتے ہیں۔ اُن کا دائرہ عمل بھی تین تا چھ ہزار میل ہوتا ہے اور یہ کافی بلندی پر دشمن کی آنکھ سے اوجھل رہ کر پرواز کرسکتے ہیں۔ اِن طیاروں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں اُترنے کے لیے وسیع اور سطح میدان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قراولی طیاروں میں خصوصاً اِن طیاروں میں جو بحری بیڑوں کی خبریں لاتے ہیں، بحری طیاروں کے نمونے کے بھی طیارے ہوتے ہیں۔

وزنی بمبار

فوج بردار

تارپیڈو بمبار

بحری طیارہ

لڑاکا

بمبار

اسی گروہ کے طیاروں میں ایک وہ طیارے بھی شامل ہیں جو تارپیڈو کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہ طیارے بالعموم بحری بیڑے کی ہمراہی میں ہوتے ہیں اور دور دور تک پرواز کرکے کشتیوں کا کھوج لگاتے ہیں اور جوں ہی کسی آبدوز سے تارپیڈو چھوڑا جاتا ہے، یہ اپنے لاسلکی کے آلہ کی مدد سے اپنے بیڑے کے کپتان کو اس کی سمت حرکت کی اطلاع دیتے ہیں تاکہ تارپیڈو کے جہاز تک پہنچنے سے پہلے جہاز راستہ سے ہٹا لیا جاسکے۔ یا یہ نہ ہوسکے تو تارپیڈو کے جہاز کے عین سامنے آتے ہی اس پر توپیں چلاکر اسے بیکار کردیا جائے۔ اس لحاظ سے بحری بیڑے کے ساتھ اس نوع کے طیاروں کا ہونا ضروری ہے۔

بحری طیارے

یہ طیارے ہوا میں بھی اُڑ سکتے ہیں اور پانی پر دخانی جہاز کی طرح تیر بھی سکتے ہیں۔ اُن کا نچلا حصہ اور بازوؤں کی ساخت دخانی کشتی سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ یہ طیارے بحری بیڑے کے ساتھ ہوتے ہیں۔ بحری لڑائی میں اُن کا وجود ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔

بمبار طیارے

بمبار طیارہ ہوائی جنگ کا سب سے زیادہ کاری حربہ ہے۔ یہ بہت بڑے ہوتے ہیں اور اُن کی ساخت بموں کی نوعیت پر مبنی ہوتی ہے یہ بمبار ہر قسم کے بم لیجاتے ہیں خواہ وہ سوا دو پونڈ کے آتش افروز بم ہوں یا ایک ہزار پونڈ کے وزنی بم ہوں، بعض بمباروں میں تو ایک یا دو وزنی بم ہوتے ہیں اور بعض میں ہزاروں چھوٹے چھوٹے بم۔

بڑا اور وزنی ہونے کے اعتبار سے، بمبار کی رفتار لڑاکہ طیاروں کے مقابلہ میں کم، لیکن کارکردگی کے نقطۂ نظر سے کافی زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ جنگِ عظیم میں اُن کی رفتار ۸۰ میل فی گھنٹہ تھی لیکن آج بڑے بڑے وزنی بمبار ۳۰۰ میل سے زیادہ کی رفتار سے پرواز کرتے ہیں۔ نیز یہ قدیم بمبار اٹھارہ ہزار فٹ کی بلندی تک ہی پرواز کرسکتے تھے اور آج کل کے بمبار ۳۰ ہزار فٹ بلندی تک اُڑ سکتے ہیں اور اپنے ساتھ پانچ، دس ہزار پونڈ وزن کے بم لیجاتے ہیں۔

مشقی طیارہ

غوطہ زن بمبار

اس قدر وزنی ہونے اور وزن لیجانے کے باوجود آج اُن کا دائرہ عمل تین ہزار میل کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اِن بمباروں میں ایسے اعلیٰ درجہ کے نازک آلات لگے ہوتے ہیں کہ بم انداز صحیح تر نشانہ پر بم پھینک سکتا ہے۔ اگر ہوا یا موسم کی یکایک تبدیلی متاثر نہ کرے تو ناممکن ہے کہ کوئی نشانہ خطا کرجائے۔

انھیں بمباروں میں ایک اور قسم کے بھی بمبار ہوتے ہیں جنھیں "طویل احاطہ کے وزنی بمبار" کہا جاتا ہے ان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بہت وزنی ہوتے ہیں بغیر کسی امدادی رسد کے کافی طویل فاصلے طے کرتے ہیں اور پھر اپنے ساتھ کافی وزن کے بم لیجا سکتے ہیں۔

غوطہ زن بمبار یہ چھوٹی قسم کے بمبار ہیں۔ اُن کی رفتار کافی زیادہ ہوتی ہے، یہ بڑی بلندی پر پرواز کرتے ہیں اور ساتھ ہی تیزی کے ساتھ غوطہ لگا کر نشانہ کے بالکل قریب آجاتے ہیں اور نشانہ پر ضرب لگانے کے بعد فوراً غیر معمولی تیزی سے اُونچے ہوجاتے ہیں۔ اُن کی رفتار کے آگے لڑاکہ طیارے اور طیارہ شکن توپیں عاجز آجاتی ہیں۔ اُن کا حملہ خطرناک ہوتا ہے۔

جنگی طیاروں کا پرواز

سہولت اور حفاظت کے مدنظر جنگی طیارے اور بمبار ہوائی بیڑے کی شکل اُڑتے وقت خاص احتیاط کرتے ہیں، علی العموم چھوٹے اور ہلکے بمبار جب ایک ساتھ پرواز کرتے ہیں تو اُن کی ترتیب انگریزی حرف وی " V " کی ہوتی ہے۔

وی

اس ترتیب میں پرواز کرنے کا مقصد ایک وسیع رقبہ پر بمباری کرنا ہوتا ہے۔

جب بمبار فوجی چھاونیوں پر دھاوا بولنے جاتے ہیں تو اُن کے ساتھ لڑاکہ طیارے بھی ہوتے ہیں۔ بیچ میں بمبار ہوتے ہیں اور دونوں بازو اور سامنے کی طرف لڑاکہ طیارے اُسے "ایسٹرن ترتیب" کہتے ہیں۔ اس صورت میں لڑاکہ طیارے آگے بڑھکر دشمن کے طیاروں کا مقابلہ کرتے ہیں اور بمبار طیارہ اطمینان سے اپنا کام کرتا ہے۔

بمبار کبھی قطار کی ترتیب میں بھی پرواز کرتے ہیں اس کا مطلب بمباری نہیں ہوتا بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ زمین پر آنا چاہتے ہیں۔

ایک اور ترتیب "سِلاب ترتیب" Salb Pormation کہلاتی ہے۔ اس میں بمباروں کا ایک بڑا بیڑا ہوتا ہے جو ایک وسیع رقبہ پر زبردست بمباری کی غرض سے نکلتا ہے۔ آتش افروزی کے لئے بمبار کچھ اسی طرح کی ترتیب میں اُڑتے ہیں۔

حیاتِ انسانی

جسم انسانی کو ایک مشین تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہ مشین معمولی سادہ مشینوں سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ صحت مند زندگی گذارنے کے لیے جسمانی مشین کے اعمال اور اس کے پرزوں سے واقفیت ضروری ہے۔

جسم کے بڑے حصّے جسم انسان حب ذیل حصّوں پر مشتمل ہے:-

سر، گردن، دھڑ اور بازو۔

سر میں آنکھیں، کان، ناک، منہ اور دوسرے حصے ہوتے ہیں دماغ سر میں ایک مضبوط استخوانی ڈبے کے اندر محفوظ ہے۔ سر کا تعلق گردن کے ذریعہ دھڑ سے ہے۔ گردن میں سامنے کی طرف ایک حلقہ دار نالی ہوتی ہے جسے ہوا نالی کہتے ہیں۔ اس کے ذریعہ ہوا جسم میں داخل ہوتی ہے۔ گردن کے پچھلے حصے میں ریڑھ کی ہڈی کا کچھ حصہ محسوس ہوتا ہے۔ ہوا نالی اور ریڑھ کی ہڈی کے درمیان غذائی نالی ہوتی ہے۔ گردن میں خون کی نالیاں اور اعصاب بھی ہوتے ہیں۔

دھڑ جسم کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس کا اوپری حصّہ سینہ اور نچلا حصہ پیٹ کہلاتا ہے۔ دھڑ کے پچھلے حصے کے وسط میں ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔ سینے کے اوپری حصے میں دونوں طرف ہنسلی کی ہڈی ہوتی ہے۔ سامنے کے حصے میں ایک چپٹی ہڈی ہوتی ہے۔ سینے کے دونوں جانب پسلیاں ہوتی ہیں۔ بعض پسلیاں سامنے کی طرف سینے کی ہڈی سے جڑی ہوتی ہیں۔ سینے کے بائیں جانب پانچویں اور چھٹی پسلیوں کے درمیان دل ہوتا ہے جس کی حرکت محسوس کی جا سکتی ہے۔

سینے اور پیٹ کے درمیان ایک جھلی ہوتی ہے جسے ڈیا فراغمہ کہتے ہیں۔ یہ اوپر کی طرف محدب اور نیچے کی طرف مقعر ہوتی ہے۔ سینے میں دونوں جانب دو پھیپھڑے ہوتے ہیں۔ دل دونوں پھیپھڑوں کے درمیان واقع ہے اور بائیں جانب جھکا ہوا ہے۔

پیٹ میں حب ذیل اعضاء ہوتے ہیں:-

(۱) ڈیا فراغمہ کے عین نیچے سیدھے جانب ایک گہرا سرخ عضو پایا جاتا ہے جسے جگر کہتے ہیں اس کے اگلے کنارے کے سامنے چھوٹی سبز تھیلی ہوتی ہے جسے پِتا کہتے ہیں اس میں جگر کا پیدا کردہ صفرہ جمع ہوتا ہے۔

(۲) ڈیا فراغمہ کے نیچے بائیں جانب معدہ ہے۔ اس کا رنگ خاکستری سفید ہوتا ہے۔

(۳) معدے کے نیچے بائیں جانب طحال ہوتی ہے۔

(۴) معدے کے دائیں سرے سے چھوٹی آنت شروع ہوتی ہے اس آنت کے ابتدائی حصے کو Dende num کہتے ہیں۔ یہ مڑا ہوا ہوتا ہے۔ اثنا عشری کے موڑ میں لبلبہ واقع ہے چھوٹی آنت کا بقیہ حصّہ بہت کچھ

پیچ دار رہتا ہے۔ اِنسان کی چھوٹی آنت کا طول تقریباً ۲۴ فٹ ہوتا ہے۔

(۵) اِس کے ساتھ بڑی آنت ملی ہوتی ہے۔ یہ چھوٹی اور موٹی ہوتی ہے۔ بڑی کا ابتدائی حصہ Coecur. کہلاتا ہے۔ اِس میں ایک چھوٹا سا حصہ آگے کی جانب نِکلا ہوا ہوتا ہے جسے کرم نما معائے زائدہ کہتے ہیں۔ بڑی آنت کا سیدھے جانب کے حصے کو اِجہرتی قولون کہتے ہیں۔ جگر تک چڑھنے کے بعد وہ معدہ کے اطراف بائیں جانب نکلتی ہے اُسے آلوی قولون کہتے ہیں۔ اِس سے بڑی آنت معدہ کے بائیں جانب سے نیچے اُترتی ہے اُسے نزولی قولون کہتے ہیں۔ بڑی آنت کا آخری حصہ سیدھا ہوتا ہے جسے معائے مستقیم کہتے ہیں۔ معائے مستقیم کا سِرا مبرز میں کھلتا ہے۔

(۶) مثانہ معدے کے نچلے حصے میں سامنے کی طرف ہوتا ہے۔ معائے مستقیم اُس کے نیچے سے گزرتی ہے۔

اگر کسی جانور مثلاً چوہے کی آنتوں کو اور معدہ اور جگر کو احتیاط سے کاٹ کر نکال لیں تو گردے دکھائی دیں گے۔ گردے تعداد میں دو ہوتے ہیں اور ریڑھ کی ہڈی کے ہر دو جانب ایک ایک واقع ہوتا ہے۔ اُن کا رنگ گہرا سرخ ہوتا ہے اور شکل پھلی جیسی ہوتی ہے۔ گردوں کا تعلق باریک نالیوں کے ذریعہ مثانہ سے ہوتا ہے۔
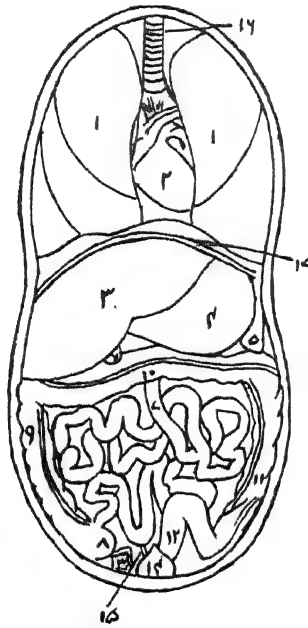
جوارح میں ہاتھ اور پیر شامل ہیں۔ اُن کے اندر سخت ہڈیاں ہوتی ہیں۔ اُن پر گوشت اور عضلات مڑے ہوتے ہیں اور خون کی نالیاں اور اعصاب چوطرف پھیلے ہوتے ہیں۔

ڈھانچہ
SKELETON

ہم مکان بناتے ہیں تو اس کے لئے ایک طرح کے ڈھانچہ کی ضرورت لاحق ہوتی ہے تاکہ اُس پر عمارت قائم کی جا سکے۔ اس کے لئے پایہ، ستون دیوار، شہتیر وغیرہ درکار ہیں۔ اسی طرح سے جسم کی عمارت بھی ایک خاص قسم کے ڈھانچہ پر قائم ہے لیکن اس ڈھانچہ اور مکان کے ڈھانچہ میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر ثابت یا غیر متحرک ہے اور ثانی الذکر حرکت پذیر۔ اِنسانی ڈھانچہ مختلف وضع اور جسامت کی کوئی دو سو سے زیادہ ہڈیوں پر مشتمل ہے۔ یہ بحیثیت مجموعی نہ صرف جسم کو سنبھالتا ہے بلکہ مختلف اعضاء کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ سہارا دینے والی ہڈیاں ٹانگیں اور ریڑھ کی ہڈی ہے اور اعضاء کو محفوظ رکھنے والی ہڈیوں میں کھوپڑی، کولھے کی ہڈیاں، ایڑ کی ہڈی اور پسلیاں ہیں۔
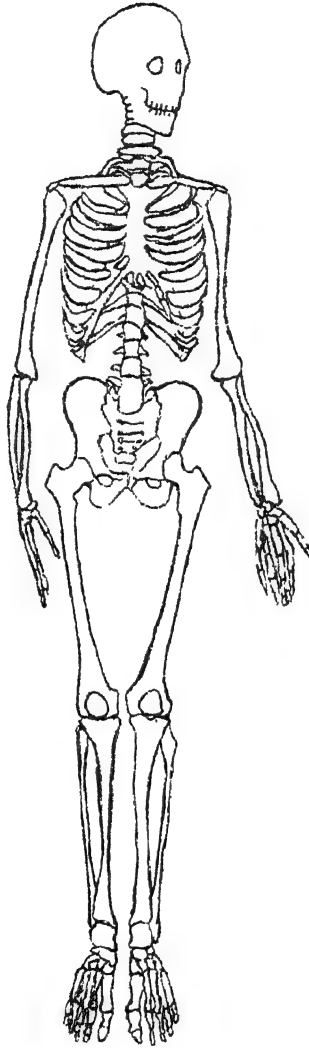
سر میں ۲۲ ہڈیاں ہوتی ہیں جن میں ۱۴ جبڑے کی ہڈیاں شامل ہیں۔ یہ ہڈیاں جسم کے سب سے زیادہ قیمتی خزانہ یعنی دماغ کو محفوظ رکھتی ہیں جو نفس، روح، ذہانت، ارادہ تحسسات وغیرہ کا مرکز اور سارے جسم کا حاکم ہے۔ اِس کے یہ حصہ جتنا اہم ہے اتنا نازک بھی ہے۔ ذرا شدت سے صدمہ پہنچ جائے تو موت یا خلل دماغ ہونے کا اندیشہ ہے۔ اِسی باعث قدرت نے دماغ کو اس درجہ مضبوطی کے ساتھ محفوظ رکھا ہے اور اُسے ایک نہیں بلکہ کئی ہڈیوں کے مجموعے سے اسی لئے ڈھانکا ہے کہ اگر ان میں سے بعض ٹوٹ بھی جائیں تو اُنہیں درست کیا جا سکے ورنہ اگر وہ ایک ہی ہڈی کا بنا ہوتا تو ایک جگہ صدمہ پہنچنے سے پوری ہڈی متاثر ہوتی۔

سر کے دو بڑے حصے ہوتے ہیں۔ ایک کھوپڑی جو دماغ کو محفوظ رکھتی اور کل سر کی دو تہائی ہے اور دوسرا چہرہ۔ کھوپڑی میں آٹھ ہڈیاں ہوتی ہیں جو ایک خاص قسم کے جوڑ سے مربوط ہوتی ہیں۔ اس میں خاص بات یہ ہوتی ہے

اب ہم ڈھانچہ کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کر کے غور کریں گے (۱) سر (۲) دھڑ اور جوارح (Limbs)

کہ بچے میں یہ جڑی ہوئی نہیں ہوتیں تاکہ دماغ آسانی سے نشوونما پاسکے۔ نیز اُن کے درمیان دو درازیں بھی ہوتی ہیں جو پیدائش کے وقت دباؤ کے پڑنے کے بعد ٹوٹنے سے بچاتی ہیں۔ یہ درازیں ۲ سال کی عمر میں بند ہوجاتی ہیں۔ اِس لئے ضروری ہے کہ ۲ سال کی عمر کو پہنچنے تک اس امر کی احتیاط کی جائے کہ بچہ کے سر کو ذرا صدمہ نہ پہنچے۔

Muscular system کی حفاظت کرتی ہے۔ نخاع بھی دماغ کی طرح نازک ہے۔ اگر اُسے کسی جگہ سے کاٹ دیں تو اس حصہ میں نہ تو احساس ہوگا اور نہ حرکت کی قابلیت، بلکہ وہ بالکل مفلوج ہو جائیگا۔ اگر کسی شخص کے نخاع کو کاٹ کر اس کے پیروں کو چرکا دیا جائے تو اسے اُس کا ذرا بھی احساس نہ ہوگا۔

سامنے سے بازو سے
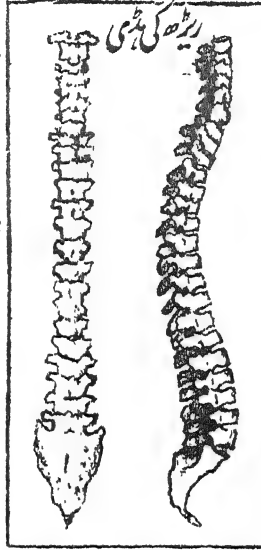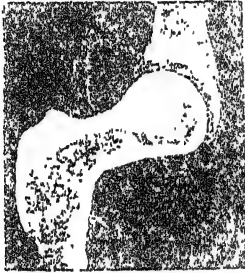
فقرہ

پیالی اور گولی کا جوڑ

غیر متحرک جوڑ

دھڑ کا حصہ ریڑھ کی ہڈی پسلیوں اور سینہ کی ہڈیوں پر مشتمل ہے۔ ریڑھ کی ہڈی ایک نہیں بلکہ ۳۳ ہڈیوں کا مجموعہ ہے جو ایک دوسری سے زنجیر کی طرح جڑی ہوئی ہیں۔ ایک کو فقرہ کہتے ہیں۔ اِن مختلف ہڈیوں کے باعث ہم آسانی سے جھک سکتے ہیں۔ اِس کے علاوہ ریڑھ کی ہڈی نخاع
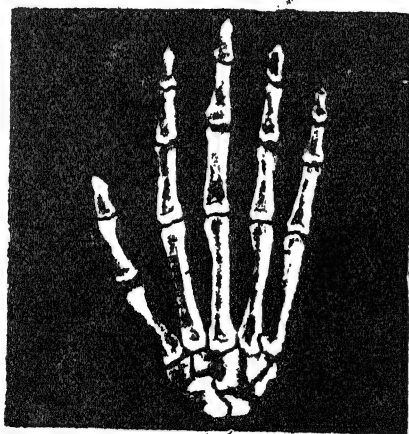
پسلیاں دیگر اہم اعضاء، دل اور پھیپھڑوں کے لئے محفوظ پنجرے کا کام دیتی ہیں ہر طرف ۱۲ پسلیاں ہوتی ہیں اور ہر پسلی ریڑھ کی ہڈی سے سینہ کی ہڈی تک خمیدہ ہوتی ہے۔ کوٹھے کی ہڈیاں گویا ایک کشادہ منہ کا برتن ہیں جو شکم اور اُس کے مافیہات کو سہارے ہوئے ہے۔

ہاتھ کی ہڈیاں

جوارح میں ٹانگیں اور بازو شامل ہیں گویا ہاتھ، انگلیاں، کلائی، انگوٹھے وغیرہ

سب داخل ہیں۔ بازو میں مونڈھے کی ہڈی، ہنسلی کی ہڈی،
اُوپر کا بازو، اگلا بازو، کلائی، ہتیلی اور انگلیاں شامل ہیں،
اگلے بازو میں دو، کلائی میں آٹھ، ہتیلی میں پانچ، ہر انگلی
میں تین تین اور انگوٹھے میں دو ہڈیاں ہوتی ہیں۔

ٹانگ میں کولھے سے گھٹنے تک ایک لمبی ہڈی
ہوتی ہے اور گھٹنے میں ٹخنے تک دو اور ٹخنہ میں سات
ہڈیاں ہوتی ہیں۔ اُن میں ایک ہڈی نسبتاً بہت بڑی
ہوتی ہے جو ایڑی کا کام دیتی ہے۔ پنجہ میں ۵ ہڈیاں
ہوتی ہیں اور پنجہ کی انگلیوں میں تین تین اور انگوٹھے میں
۲ ہڈیاں ہوتی ہیں۔

ہڈیوں کی تعداد میں زیادتی حرکت اور گرفت
میں مدد دیتی ہے۔

جہاں کوئی سے دو ہڈیاں ملتی ہیں وہاں جوڑ
ہوتا ہے۔ ایسے جوڑ تین قسم کے ہوتے ہیں۔

(۱) ایسے جوڑ جو مانع حرکت ہیں۔

(۲) ایسے جوڑ جو Hinge کا کام دیتے ہیں
یعنی ایک محور پر حرکت کرتے ہیں۔

(۳) ایسے جوڑ جو پیالے میں گولے کی طرح حرکت
کرتے ہیں Ball and Socker اُن کی
حرکت کئی محاور پر ہوتی ہے۔

کھوپری کے جوڑ قسم اول کے جوڑ ہیں۔ اس طرح سے
کھوپری کی ہڈیاں نہایت مضبوطی سے جڑی ہوتی ہیں۔
کہنی اور گھٹنے کے جوڑ Hinge کے مانند ہوتے ہیں جن
سے ہڈیاں آگے پیچھے کی طرف حرکت کر سکتی ہیں۔ ران
اور کندھے کے جوڑ تیسری قسم کے ہیں جن میں ہڈیاں
ہر سمت میں حرکت کر سکتی ہیں۔

نظام عضلی

MUSCUL AR SYSTEM

جس طرح جسم کی ہڈیوں کا نظام اہم ہے، عضلی نظام
بھی خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اُس کے بغیر دماغ کے
احکامات کی تعمیل ممکن نہیں۔

عضلات کی شکل و صورت اُن کے کام کی نوعیت
کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے بعض عضلات تو گوشت
کے پتلے اور چپٹے فیتے اور چادریں اور بعض لانبی ڈوریاں۔

عضلات ہماری خواہش کے مطابق حرکات اور
افعال میں مدد دیتے ہیں۔ ہم محض عضلات کی بدولت
ہماری ہڈیوں کو حرکت دے سکتے ہیں۔ عضلات گوشت
پر مشتمل ہیں اور درحقیقت یہ گوشت کے ریشے یا گچھے ہیں

عضلات دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ ہیں جو
بلا ارادہ کام کرتے ہیں اور دوسروں کے لئے ارادہ کی
ضرورت ہوتی ہے۔ دل ایک بڑا عضلہ ہے جو بغیر ہمارے
ارادے کے دن و رات کام کرتا ہے۔ تنفسی عضلات
کا حال بھی بالکل اُسی کے مماثل ہے۔ یہ عضلات غیر ارادی
عضلات کہلاتے ہیں۔ اب دیگر عضلات مثلاً ٹانگ،
ہاتھ وغیرہ کے عضلات پر غور کیجئے۔ اُن کی حرکت ہمارے
ارادہ کے تابع ہوتی ہے۔ اُنہیں ارادی عضلات
کہتے ہیں۔ پس عضلات کی دو قسمیں ہوئیں (۱) ارادی
Voluntary (۲) غیر ارادی Involuntary

عضلات کے سرے چھوٹے Tendons
کے ذریعہ ہڈیوں سے جڑے ہوتے ہیں۔ یہ مضبوط

ڈوریاں ہیں جو ایک سخت مضبوط اور لچکدار مادہ سے جسے کرکری ہڈیاں یا غضروف کہتے ہیں، بنی ہوئی ہیں۔

عضلات کے سکڑنے سے ہڈی حرکت کرتی ہے سکڑنے سے عضلات پھول جاتے ہیں مثلاً کہنی موڑنے سے بازو کے عضلات پھول جاتے ہیں۔ حرکت کے لئے ایک عضلہ کام میں نہیں لایا جاتا بلکہ کئی عضلات کا استعمال حرکت کا موجب ہوتا ہے۔

ہمارا تمام جسم مختلف قسم کے عضلات سے ڈھنکا ہوا ہے۔ ان میں سے بعض زیادہ استعمال میں آتی ہیں اور بعض کم۔ بیرونی عضلات میں سب سے زیادہ اہم اوپری بازو کے سامنے اور پیچھے کے عضلات، کندھے کے بازو، سامنے اور پیچھے کے عضلات، سینے، پیٹ، پشت، ران کے سامنے اور پیچھے اور پنڈلی کے عضلات ہیں۔ انہیں زیادہ کام کرنا پڑتا ہے اسی باعث وہ نسبتاً مضبوط اور توانا ہوتے ہیں۔

عضلات کے کام کرنے سے توانائی صرف ہوتی ہے خون اس صرف شدہ توانائی کی تلافی کر کے اس میں مزید توانائی کی سربراہی کرتا ہے۔ عضلات کو دراصل زندگی کی توانائی سے کوئی خاص علاقہ نہیں البتہ جہاں جسمانی کام کی ضرورت ہوتی ہے وہاں عضلات کی اہمیت مسلّم ہے عورتوں کے عضلات مردوں کے مقابلہ میں بہت کمزور ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں توانائی کا کافی خزانہ موجود ہوتا ہے، ان کی عمروں کا اوسط زیادہ اور نقصان خون اور اشتہا کو برداشت کرنے کی اہلیت کافی ہوتی ہے۔ اگر عضلات ہی پر زندگی کی توانائی کا انحصار ہوتا تو عورتوں میں یہ خصوصیت نہ ہوتی۔ اس مثال سے ہمارا منشا یہ نہیں ہے کہ عضلات کی کوئی اہمیت نہیں ہے یا وہ بالکل بیکار ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جسم کے افعال اور احکامات کی تعمیل میں انہیں کا زیادہ حصہ ہے اور ان کے بغیر چارہ نہیں۔

اعصاب کا خاکہ

اگر عضلات کو کافی غذا اور ورزش کا موقع ملے تو وہ نہایت خوبصورت بنتے اور احکامات کی تعمیل میں زیادہ

چستی اور چالاکی دکھاتے ہیں اُس کے لئے ورزش اور کھیل کی سخت ضرورت ہے۔ اگر عضلات اچھے ہوں تو دماغ اور جسم دونوں ہم آہنگی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ مثل مشہور ہے "اچھے جسم میں اچھا دماغ ہوتا ہے۔" سوائے چند مستثنیات کے یہ مقولہ بنی نوع انسان میں عمومیت رکھتا ہے۔ اسی لئے اچھی صحت اور اچھے دماغ کے لئے جسم کو اچھا رکھنا نہایت ضروری ہے۔

ورزش جسمانی کے اثرات کی تفصیل ذیل کے خاکہ سے ظاہر ہے۔

ورزش جسمانی کے اثرات

- جسمانی
  - نمو جسمانی
  - تغذیہ
- تعلیمی
  - مثلاً ضبط، احکامات کی عاجلانہ تعمیل، برداشت، خود ضبطی، اتحاد وغیرہ
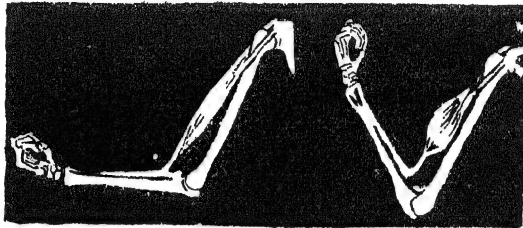
خامیوں کو دُور کرتی ہے یعنی تعمیری

اِس لحاظ سے بچوں اور بڑوں سب کے لئے ورزش، تفریح کھیل کود بہت فائدہ مند ہے۔

تکان اور اُس کے اسباب

یہ بہت عام بات ہے کہ زیادہ کام کرنے سے تکان پیدا ہوتی ہے، اس حالت میں کام نہیں کیا جاسکتا اور اگر کیا بھی گیا تو اُس کی نوعیت بہت ادنیٰ اور خراب ہوگی۔ گویا تکان قدرت کی طرف سے ایک اِشارہ یا اِطلاع ہے کہ اب تھوڑی دیر کے لئے کام روک دیا جائے۔

تکان کے مسئلہ پر تحقیقات کرکے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ تکان دراصل جسم کی کیمیائی توانائی کی اصراف سے نہیں بلکہ اس کیمیائی توانائی کی پیداوار کے سلسلہ میں جو ضمنی حاصلات ہوتے ہیں اُن سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ضمنی حاصلات زہریلے مادوں پر مشتمل ہوتے ہیں اس طرح سے تکان کی نوعیت مشین میں تیل کی کمی کے مماثل نہیں بلکہ مشین میں اُس گرد کے مماثل ہے جو مشین کی کارکردگی پر اثر انداز ہونے کے علاوہ، اس کے کل پرزوں کو خراب بنا دیتی اور بالآخر مشین کی خرابی کا سبب بنتی ہے۔ جس طرح مشین سے گرد کو دور کرنا ضروری ہے اسی طرح اُن زہریلے مادوں کو جسم سے خارج کرنا ناگزیر ہے خون اُس زہریلے مادے کو صاف کرتا ہے۔ تکان کی صورت میں انسان کو فوراً اُس کے اندفاع کی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر تکان محسوس ہونے کے بعد بھی کام کیا جائے تو تھوڑی دیر میں زہریلے فضلے کی تعداد بڑھ کر جسم کی عام صلاحیتِ کار اور کارکردگی پر اثر پڑے گا۔

تکان کو دُور کرنے کے اسباب میں سب سے اول آرام لینا ہے۔ گرم پانی سے حمام کرکے جسم کی مالش کرنا بھی مفید ہے۔ اس سے خون جلد کی طرف دوڑے گا اور جلد سے زہریلے مادوں کا اخراج عمل میں آئیگا۔ ایک اور موثر طریقہ کام کی نوعیت بدلنا ہے جس سے تھکے ہوئے حصے تازہ دم ہوجاتے ہیں۔ اسی لئے جسمانی اور دماغی کام کو

ملا کر باری باری سے انجام دینا۔ تکان کی بری حد تلافی کرتا ہے عام تکان کی صورت میں نیند بہترین مداوا ہے۔

دوری نظام

CIRCULATORY SYSTEM

دوری نظام دل، دموی نالیوں اور ان کے اندر کے خون پر مشتمل ہے۔

خون خالی آنکھ سے دیکھنے سے سرخ نظر آتا ہے لیکن خوردبین سے زردی مائل مائع دکھائی دیتا ہے جو دو قسم کے چھوٹے چھوٹے جسیموں پر مشتمل ہے۔

(۱) زرد (سرخ) جسیمے ان کی شکل قرص کے مانند ہوتی ہے۔ ہر قطرہ میں ان کی تعداد ۵ × ۱۰ ٦ ہے۔ ان میں ہیموگلوبین ہوتا ہے جو ایک نائٹروجنی مادہ ہے اور جسے آکسیجن کے ساتھ خاص رغبت ہے جس سے ملکر وہ آکسی ہیموگلوبین بنتا ہے جس کا رنگ سرخ ہے۔

(۲) سفید جسیمے بھی امیبا کی طرح اپنی کوئی خاص شکل نہیں رکھتے۔ یہ سرخ سے بڑے ہوتے ہیں اور تعداد میں کم۔ سفید و سرخ میں نسبت ۱ : ۵ ہے۔ یہ جسیمے اپنی مرضی کے مطابق کام کرتے ہیں اور ان کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ غذا کھاتے ہیں اور بیماری کے جراثیم کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔ جب کسی بیماری کے جراثیم جسم پر حملہ آور ہوتے ہیں تو سفید جسیمے ان کا بڑی شد و مد سے مقابلہ کرتے ہیں اور اگر ان کی طاقت بڑھ گئی تو بیماری کے جراثیم کو شکست دیدیتے ہیں لیکن اگر جراثیم کو ان جسیموں پر فتح حاصل ہوگئی تو جسم پر بیماری کا حملہ ہوجاتا ہے۔

خون کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ذرا ہوا کھاتے ہی جم جاتا ہے، یہ گویا زخم کے خلاف قدرت کا انتظام ہے کہ کہیں زخم لگا اور سینہ پر خون جم کر مزید خون بہنا بند ہوگیا۔

خون جسم کے ہر حصہ میں ہوتا ہے سوائے ناخن بال اور بیرونی جلد کے۔ اسی خون پر زندگی کا انحصار ہے۔ اگر یہ خراب یا غیر خالص ہو تو صحت خراب ہوجاتی ہے۔ اگر کسی طرح سے خون جسم سے ایک ثلث سے زائد خارج ہوجائے تو موت کا واقع ہونا لازمی ہے۔ خون کا وزن جسم انسانی کے وزن کا ۱/۱۲ سے ۱/۱۳ تک ہوتا ہے۔

خون ایک مسلسل موج کی طرح دموی نالیوں کے ذریعہ سارے جسم میں دوڑتا ہے اور اس کا سفر دل سے شروع ہوکر پھیپھڑوں میں ختم ہوتا اور پھر تازہ اور صاف ہوکر دل سے نکلتا اور جسم کو غذا پہنچاتا، صاف کرتا اور گرماتا جاتا ہے۔

دل کی ساخت

دل کی شکل کیفدریان نما ہوتی ہے اور اسکی جسامت ہر انسان کی اس کی اپنی بند مٹھی کے برابر۔ اس کا محل وقوع سینہ کے وسط میں ہے۔ یہ ڈایا فرائمہ Diaphragm پر ٹکا ہوا اور کسیقدر بائیں جانب جھکا ہوا ہوتا ہے۔ یہ ایک دو جھلی والی تھیلی میں بند ہوتا ہے اور ان دو جھلیوں کے درمیان ایک لیس مادہ ہوتا ہے جو دل کے پھولنے اور سکڑنے پر جھلیوں کے درمیان رگڑ پیدا ہونے نہیں دیتا۔

سینہ کے بقیہ حصہ میں پھیپڑے ہوتے ہیں۔ دیافراغمہ کے نیچے پیٹ ہوتا ہے گویا دیافراغمہ سینہ اور پیٹ کے درمیان ایک حائل پردہ ہے۔ اِن ہر دو حصوں میں سے کسی ایک کا بھی بڑھ جانا دل پر دباؤ ڈالکر اُس کی باقاعدہ حرکت میں خلل پیدا کرتا ہے۔

قلب انسانی چار خانوں پر مشتمل ہے۔ دو اُوپر ہوتے ہیں جنھیں اذین Auricle کہتے ہیں۔ اور دو نیچے جنھیں بطین Ventricle کہا جاتا ہے۔ بائیں اذین اور بطین کے درمیان ایک کھلمندن Valve ہوتا ہے جو صرف نیچے کی طرف کھلتا ہے۔ اِسی طرح کا تعلق سیدھے اذین اور بطین میں بھی ہے۔

اذین خون حاصل کرنے کے نیچے کے نسبتاً بڑے اور مضبوط خانوں میں بھیجتا ہے۔ اُس کی دیواریں کسیقدر پتلی ہوتی ہیں کیونکہ اُس کا کام کھلمندن کے ذریعہ تھوڑے سے فاصلہ تک خون بھیجنا ہے لیکن نیچے کے خانے کسیقدر مختلف ہوتے ہیں۔ سیدھا بطین اس غیر خالص خون کو پھیپڑوں کو بھیجتا ہے جو سیدھے اذین نے جسم سے حاصل کیا ہے اس کیلئے زیادہ طاقت درکار ہے اِس لئے اُس کی دیواریں مضبوط عضبی مادّہ سے بنی ہوتی ہیں۔ اِس طرح سے بائیں بطین کا کام تمام جسم کو خون پہنچانا ہے۔ اِس لئے اس کی دیواریں بھی مضبوط ہوتی ہیں۔ یہ دل کا سب سے بڑا حصہ ہے اور دل کی حرکت جو ہمیں محسوس ہوتی ہے وہ اسی کی حرکت کا نتیجہ ہے۔

دل ایک پمپ ہے

جو پیدائش سے لیکر موت تک برابر حرکت کرتا اور دموی نالیوں کو خون پہنچانے کا کام انجام دیتا ہے۔ یہ ایک منٹ میں ۷۰ سے ۹۰ مرتبہ تک دورہ کرتا ہے۔ عورتوں کا دل اُس سے زیادہ حرکت کرتا ہے اور بچوں میں تو یہ حرکت تقریباً دوچند ہوتی ہے اِس حرکت کا اندازہ کلائی پر اُنگلی رکھکر کیا جا سکتا ہے جسے نبض کی حرکت کہتے ہیں۔ نبض کی حرکت دل کی حرکت کے کچھ ہی بعد ہوتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دل جسم میں خون کی ایک مسلسل موج روانہ کر رہا ہے۔

دل ایک غیر ارادی عُضلہ ہے جو بلا ارادہ حرکت کرتا ہے۔ اس کا رکنا موت کی دلیل ہے۔ دیگر عُضلات کی طرح یہ بھی سُکڑ اور پھیل کر اپنا کام انجام دیتا ہے جب دل سکڑتا ہے تو تمام خون اِس طرح نکل جاتا ہے جس طرح مشک کو دبانے سے پانی۔ غیر خالص خون ایک طرف سے نکل کر پھیپڑوں کو جاتا ہے اور خالص خون دوسری طرف سے خارج ہو کر سارے جسم میں دوڑتا ہے۔ یہ خالص خون ایک بڑی دموی نالی سے جسے شریان Artery کہتے ہیں گذرتا اور پھر چھوٹی نالیوں میں جاتا ہے۔ اِسکے بعد وہ پھر اور چھوٹی نالیوں میں جاتا ہے تا آنکہ وہ ایسی نالیوں میں داخل ہوتا ہے جو خالی آنکھ سے نظر نہیں آتیں۔ اُن بال جیسی باریک نالیوں کو عروق شعریہ Capillary tubes کہتے ہیں۔ اُن کی تعداد جسم میں اتنی زیادہ ہے کہ بغیر اُنہیں دھکا پہنچائے ہم جسم میں کسی مقام پر سوئی چبھو نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ذرا سا سوئی چبھاتے ہی خون باہر نکل آتا ہے

خون اُن شعری عروق میں اپنا کام کرتا ہے یہ آکسیجن حاصل کرتا اور ریشوں یا عضلات کے گوشت کو بنانے میں مدد دیتا اور فضلہ کو ساتھ لیجاتا ہے۔ جب ہم کوئی عُضلہ استعمال کرتے ہیں تو اُس کا کچھ حصہ کام میں آکر فضلہ بن جاتا ہے جس کا جسم سے دُور ہونا ضروری ہے۔ اب جیسے جیسے خون ان اَن گنت عروق شعریہ میں سے گذرتا ہے، اُس کی آکسیجن بتدریج گھٹتی جاتی ہے اور خالص گوشت بنانے والا مادہ صرف ہوتا اور بہت سا فضلہ یا زہریلا مادہ اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اِس طرح اُس کا رنگ بدلکر نیلگوں سُرخ ہو جاتا ہے۔ یہ خون آگے بڑھکر بڑی دموی نالیوں میں داخل ہوتا ہے

دل

وریداور اُن کا کام

تم جانتے ہو کہ خون جسم کے تقریباً تمام حصوں میں موجود ہے جسم کے مختلف حصوں میں بہت ہی چھوٹی چھوٹی دموی نالیاں ہیں جنھیں عروق شعریہ کہتے ہیں یہ عروق شعریہ اِتنی چھوٹی ہوتی ہیں کہ جسم کے خلیوں میں سے بھی گزر جا سکتی ہیں جب خون عروق شعریہ میں سے گزرتا ہے تو خلیوں کو آکسیجن دیتا ہے اور اُن سے کاربن ڈائی آکسائیڈ لے لیتا ہے۔ اِس طرح سے خون غیر خالص ہو جاتا ہے۔ یہ غیر خالص خون جسم کے مختلف حصوں سے دل میں ح . ن . ی. اور ح . س . ی. کے ذریعہ واپس آتا ہے خون کی وہ نالیاں جو خراب خون کو دل میں لاتی ہیں ورید کہلاتی ہیں

سر اور گردن کے دائیں جانب کی ایک ورید سے بازو کی وَرید سے مِلکر ایک بڑی ورید بناتی ہے۔ بائیں جانب بھی بالکل اُسی طرح ایک وَرید ہوتی ہے یہ دونوں وَرید مِلکر ح . ن . ی. بناتے ہیں جو دائیں اُذین میں کھلتی ہے۔

جسم کے نچلے حصے میں ہر پیر سے ایک خاص وَرید نِکلتی ہے۔ یہ دونوں وَرید مِلکر ح . ن . ی کا اِبتدائی حصہ بناتے ہیں۔ اَب چونکہ ح . ن . ی اُوپر کی طرف جاتی ہے تو گُردوں سے بھی خون لیتی ہے اور اُس سے ذرا اُوپر دائیں اُذین میں داخل ہونے سے قبل جگر سے ایک وَرید آکر ملتی ہے۔ معدے اور آنتوں سے غیر خالص خون راست ح . ن . ی. میں پہنچتا ہے اِن اعضا میں جو عروق شعریہ ہوتے ہیں اُن سے ایک ورید نکل کر جگر کو جاتی ہے اور پھر عروق شعریہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اِس وَرید کو ورید جگری کہتے ہیں

وَریدی نِظام

۱۔ دَایاں اُذین ۔ ۲۔ بایاں اُذین ۔ ۵۔ سَر اور گردن سے آنے وَالی وَرید۔ ۷۔ بازو سے آنے والی وَرید ۔ ۸ ۔ جگر سے آنے وَالی وَرید ۔ ۹ ۔ جگر۔ ۱۱۔ آنت ۱۲۔ پیر سے آنے والی وَرید ۔ ۱۳۔ گردے سے آنے والی وَرید۔

اِس طرح سے معدے اور آنتوں کے خون کو ح . ن . ی. میں داخل ہونے سے قبل جگر سے گزرنا پڑتا ہے۔ اِس کا مطلب آگے سمجھ میں آئے گا جسم اِنسانی کی خاص خاص

وریدوں کو شکل ( ) میں دکھلایا گیا ہے۔

شریانیں اور اُن کا کام

اب ہم خاص خاص شریانوں اور اُن کے کام پر غور کریں گے۔ شریانیں وہ دَموی نالیاں ہیں جو دل سے خون کو سارے جسم میں پہنچاتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ دائیں اُذین کا غیر خالص خون دائیں بطین میں داخل ہوتا ہے اور دایاں بطین اس خون کو شُش کی شریان کے ذریعے پھیپھڑوں کو بھیجتا ہے اِس شُش کی شریان کے دل سے نکلنے کے بعد دو حصے ہو جاتے ہیں اور ہر ایک ایک پھیپھڑے کو جاتی ہے۔ یہاں شُش کی شریانوں کی شاخیں عروقِ شعریہ میں بٹ جاتی ہیں اور چونکہ ان عروقِ شعریہ میں خون بہہ رہا ہے۔ اِس لیے وہ کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کر دیتی ہیں اور آکسیجن حاصل کر لیتی ہے۔ اِس طرح سے خون خالص ہو جاتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ پھیپھڑوں کی عروقِ شعریہ سے چار شُشی ورید نکل کر بائیں اُذین میں کھلتی ہیں۔ انھیں ورید اِس لیے کہتے ہیں کہ یہ دل میں خون لاتی ہیں۔ اور چونکہ یہ پھیپھڑے سے نکلتی ہیں اِس لیے شُشی ورید کہتے ہیں۔ پھر جیسا کہ تبلایا جا چکا ہے، بائیں اُذین سے خون بائیں بطین میں داخل ہوتا ہے۔

بایاں بطین اِس خون کو آورطہ میں بھیجتا ہے۔ آورطہ بائیں اذین سے نکلنے کے بعد مُڑ جاتی ہے (شکل) آورطہ کے اِس موڑ پر ایک شاخ نکلتی ہے جو ذرا بعد ہی کو دو اور شاخوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اِس میں سے ایک دائیں بازو کو جاتی ہے اور دوسری سَر اور گردن کے سیدھے جانب کو۔ آورطہ کے موڑ کے بائیں جانب دو علیحدہ شاخیں نکلتی ہیں جو علی الترتیب سَر اور گردن کے بائیں جانب اور بائیں بازو کو جاتی ہیں۔ اصل آورطہ مُڑ کر سینے اور پیٹ میں آتی ہے۔ یہاں سے اہم اعضاء کو شاخیں جاتی ہیں اور بالآخر یہ دو حصوں میں بٹ کر ہر پیر میں جاتی ہے۔ آورطہ کی شاخیں کئی کئی شاخوں میں بٹتی ہیں اور نازک شاخیں

قلب اور خاص خاص شریانیں

۱۔ قلب۔ ۲۔ آورطہ۔ ۳۔ بازو کی شریانیں۔
۴۔ گردن اور سَر کی شریانیں۔
۵۔ جگر کی شریان۔ ۶۔ گردے کی شریان۔
۷۔ آنتوں کی شریان۔ ۸۔ پیروں کی شریان

عروقِ شعریہ میں بنتی ہیں جو خلیوں کے درمیان سے گزر سکتے ہیں اس طرح سے دل سے نکلا ہوا خون جسم کے ہر حصے میں پہنچتا ہے۔

دَوران خون کا دل سے نکل کر سارے جسم کا دورہ لگانا اور پھر سے دل میں داخل ہونا دورانِ خون کہلاتا ہے۔ اس کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) عام دَوران۔ یعنی خون کا دل سے نکل کر مختلف حصوں کو پہنچنا اور پھر دل میں واپس آنا۔

(۲) **ششی دَوران** یعنی خون کا دائیں بطین سے نکل کر پھیپھڑوں کو ہوتے ہوئے، بائیں اذین میں پہنچنا۔

(۳) **جگری دَوران** یعنی خون کا معدے اور آنتوں سے نکلکر وریدی کے ذریعہ جگر میں داخل ہونا۔

انگلی کی شعریانیں

۱۔ انگلی ۔ ۲۔ شریان ۔ ۳۔ ورید ۔ ۴ شعریانوں کا جال

دل کی آوازیں اگر سینے کے بائیں حصے پر کان رکھیں تو دو قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں ایک آواز طویل اور مدھم ہوتی ہے۔ یہ آواز "لب، لب" کی سی ہوتی ہے۔ دوسری مختصر مگر تیز ہوتی ہے جیسے "ڈب ڈب" طویل آوازیں بطین کے سکڑاؤ اور سہ پلالی اور ذو پلالی کھلمندنوں کے سکڑاؤ سے پیدا ہوتی ہے اور مختصر اور تیز آواز نیم قمری شکل کے کھلمندوں کے بند ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔

نبض تم نے یہ دیکھا ہوگا کہ باغ میں کنوئیں سے جب پانی نکال کر نالیوں میں دَوڑایا جاتا ہے پانی ڈول کے مسلسل نلی میں گرنے میں اس میں ایک موج سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر تم اپنی انگلی شریان کے اس مقام پر رکھو جہاں وہ جلد سے بالکل قریب ہوتی ہے یعنی کلائی، ٹخنہ اور کہنی کے پاس، تو تمہیں شریان کی دیوار کا اُتار چڑھاؤ محسوس ہوگا۔ اسی کا نام نبض ہے۔ یہ لہر بھی نالی کے پانی کی موج کے مشابہ ہے شریانیں ہمیشہ خون سے پُر ہوتی ہیں۔ دل کی ہر حرکت پر مزید خون پمپ ہو کر آورطہ میں داخل ہوتا ہے۔ یہی زائد خون موج پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ یہ موجیں تمام شریانوں میں پیدا ہوتیں اور عروقِ شعریہ میں گم ہو جاتی ہیں۔ وریدیں نبض نہیں ہوتی۔ جب کسی شریان کو کاٹتے ہیں تو خون جھٹکے کر کے نکلتا ہے اور جب ورید کاٹی جاتی ہے تو خون مسلسل بہتا ہے۔ نبض اتنے ہی مرتبہ حرکت کرتی ہے جتنی مرتبہ دل حرکت کرتا ہے۔ اس لیے نبض کی حرکت سے دل کی حرکت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

دَموی نالیاں جسم میں تین قسم کے دَموی نالیاں

ہوتے ہیں۔ (۱) شریانیں (۲) عروق شعریہ اور (۳) وریدیں۔

شریانیں دِل سے خون جسم کے مختلف حصّوں میں پہنچاتی ہیں۔ اُن کی دیواریں موٹی، عضلاتی اور لچکدار ہوتی ہیں۔ یہ وَرید کے مقابلے میں کافی اندر ہوتی ہیں۔ بالعموم یہ صاف خون لیجاتی ہیں لیکن پھیپھڑوں کی شریان خراب خون لیجاتی ہیں۔ شریان میں نبض ہوتی ہے۔ جب شریان کاٹی جاتی ہے تو خون جھٹکوں سے یا زوروں سے باہر نکلتا ہے۔

عروق شعریہ

نہایت ہی باریک باریک خون کی نالیاں ہیں۔ یہ جسم کے ہر حصّے میں موجود ہوتی ہیں یہ اِتنی چھوٹی ہوتی ہیں کہ جسم کے خلیوں کے درمیان میں سے گذر جاسکتی ہیں۔

وریدیں

خون کو دِل میں لے جاتی ہیں۔ اُنکی دیواریں شریانوں کی طرح موٹی اور لچکدار نہیں ہوتیں اکثر وریدیں جسم کی سطح کے قریب ہوتی ہیں۔ وریدیں اکثر خراب خون لے جاتی ہیں لیکن شش کی وریدیں صاف خون دل میں لے جاتی ہیں وریدوں میں قبض نہیں ہوتی۔ اِن میں جیب جیسے کھلمندن ہوتے ہیں۔ چند منٹ تک ہاتھ سے ورزش کرو۔ اور ایک ورید کو اُوپر کی طرف دباؤ۔ تمہیں کچھ نہ محسوس ہوگا۔ اب اسے نیچے کی طرف دباؤ۔ تمہیں گانٹھیاں نظر آئیں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وریدوں کے جیب جیسے کھلمندن خون سے بھر جاتے ہیں اور خون کو وریدمیں واپس جانے سے رُوکتے ہیں۔ جب ورید کو کاٹا جاتا ہے تو خون آہستہ آہستہ بہہ نکلتا ہے۔

۱ ۲ ۳

وَرید کے حمام یا کِھلمندن

لمف۔
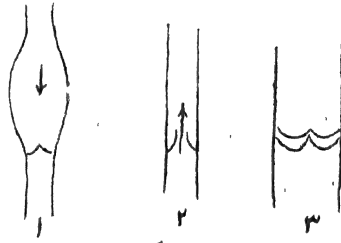
جب خون عروق شعریہ میں بہتا ہے تو خون سے ایک مائع نکلتا ہے جسے لمف کہتے ہیں اور خلیوں کو دھو دیتا ہے۔ لمف ہی کے ذریعے غذا اور آکسیجن عروق شعریہ سے خلیوں میں پہنچتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائیڈ اور فضلات خلیوں سے نکل کر عروق شعریہ میں
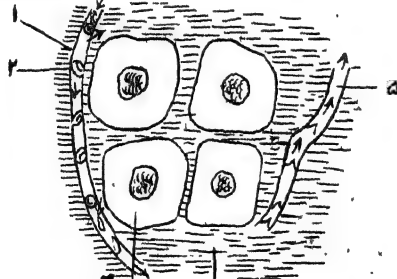
خون، لمف اور خلیوں کا باہمی تعلق

۱۔ خلیوں کو آنے والے شعریان۔ ۲۔ شعریان کے اندر کا خون۔ ۳ خلیے۔ ۴۔ لمف۔ ۵۔ خلیوں سے نکلنے والے شعریان۔

پہنچتے ہیں۔ مختلف حصوں میں پیدا ہونے والا لمف
نالیوں میں سے گزرتا ہے جنھیں لمفی نالیاں
کہتے ہیں۔ تمام لمفی نالیاں ایک بڑی لمفی نالی میں
کھلتے ہیں جسے صدر رسا مہ کہتے ہیں۔ یہ صدری مآ
جو ریڑھ کی ہڈی کے سامنے ہوتی ہے، گردن کے
بائیں بازو سے آنے والی ورید میں کھلتی ہے۔ پس
اِس طرح سے مختلف حصوں کے خون میں پیدا ہونے والا
لمف خون میں واپس آجاتا ہے۔

اُردو شاعری

غزل

(از حضرت شیخ فرید شکر گنج تا ذوق)

اُردو غزل کی ابتدا

صحیح طور پر یہ بتانا ناممکن ہے کہ اُردو غزل کی ابتدا، کب ہوئی اور کس نے سب سے پہلے غزل کی داغ بیل ڈالی۔ البتہ یہ بات عام طور پر محققین کے نزدیک قابل قبول ہے کہ دکن ہی سے اُردو غزل کی ابتدا ہوئی اور کسی دکنی شاعر نے سب سے اول اس صنف میں طبع آزمائی کی۔

حضرت شیخ فرید شکر گنج رح کی ولادت ۵۶۹ھ اور وفات ۶۶۴ھ میں ہوئی۔ آپ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح کے مُرید اور خلیفہ تھے اور پاک پٹن میں رہتے تھے۔ جدید تحقیقات کی رُو سے ذیل کی غزل آپ کے نام سے موسوم کی جاتی ہے:۔

وقت سحر وقتِ مناجات ہے
خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا
خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے

با تن تنہا چہ روی زیر زمین
نیک عمل کن کہ وہی رات ہے
پند شکر گنج کہ بدل و جان شنو
ضایع مکن عمر کہ ہیہات ہے

حضرت امیر خسرو رح جن کی ولادت ۶۳۲ھ اور وفات ۷۲۵ھ میں ہوئی سلسلہ چشتیہ میں صاحب دل بزرگ گذرے ہیں۔ ریختہ میں ان کے بہت سے اشعار ملتے ہیں۔ بہت سی غزلیات بھی اُن کے نام سے موسوم ہیں۔ حسب ذیل غزل زیادہ مشہور رہی ہے اور اکثر تذکروں میں اس کے بعض شعر نظر آتے ہیں۔

زحال مسکیں مکن تغافل، دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں، نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہرآں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
بحق روز وصال دلبر، کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت من کے ورا راکھوں جو جائے پاؤں پیا کے کھتیاں

حضرت سید محمد حسینی المعروف بہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ؒ سلطان فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں ۸۱۵ھ میں گلبرگہ آئے اور آپ نے سال بعد انتقال کیا۔ آپ کی تصنیفات کو جہاں نثر کی اولیں کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے وہاں آپ کے نام سے بہت سے اشعار بھی منسوب ہیں۔

قطب شاہی

قطب شاہی سلاطین نہ صرف ادب نواز اور علم دوست تھے بلکہ اکثر خود بھی شعر کہتے تھے بعض کی غزلوں کے نمونے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ المتخلص بہ قطب شاہ و معانی (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) کا کلیات ان کے بھتیجے نے ۱۰۲۵ھ میں مرتب کیا۔ ان کا رنگ تغزل حسب ذیل غزل سے ظاہر ہو سکتا ہے:۔

گرجا ہے میگہ سرتھے تازہ ہوا ہے بستاں
پھولاں کی باس پایا بلبل ہزار دستاں
اے خوش خبر صبا تو لے جا جواں قداں کن
چمناں کی آرزو میں بیٹھے ہیں مے پرستاں
اونہو نہال پھولاں ہے جام خوئی سو بادہ
نرگس اپس پلک سوں جھاڑو کرے شبستاں
کھ نور پر دسے یوں مج خط عنبریں رو
جوں سورا پر ہے بادل ریہاں سوں گلستاں
روزی ہوا قطب شہ تج عشق کا پیالہ
بھرے ہیں ہر طرف توں جم شوق کے خمستاں

محمد قلی قطب شاہ کا جانشین محمد قطب شاہ (۱۰۲۰ھ تا ۱۰۳۵ھ) بھی صاحب دیوان گذرا ہے اُن کا تخلص ظل اللہ تھا نمونہ کے طور پر غزل کے تین شعر ملاحظہ ہوں۔

چلے چندنی میں جب لٹک پیو ہمارا
او نن عکس دیپے چندر تھے اپارا
بجنے سائیں کے عشق کا مد پیا ہے
نکرسی اوسے ہور مستی اوتارا
پیا نور بتا ہے ہنج دل جھمک میں
کہ جس نور سے ہے سراج آشکارا

محمد قطب شاہ کے فرزند عبد اللہ قطب شاہ بھی شاعر تھے اور عبد اللہ تخلص کرتے تھے۔ ان کا زمانہ ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ ہے نمونہ کلام حسب ذیل ہے:۔

اے پری پیکر ترا مکھ آفتاب
دیکھتا ہوں تو رہے نا منج میں تاب
یں تجے بلقیس کوں تو کیا عجب
ساچ ہے بلقیس کا تج کو خطاب
تجہ بہشتی حور کوں دیکھا ہے جن
جم حرام اس پو ہے دوزخ کا عذاب
شاہ عبد اللہ نبی صدقے تجے
خوب رویاں میں کیا ہے انتخاب

اس دور کے ہم دو درباری شاعروں کا ذکر کریں گے

جو اپنے فن کے کمال کی وجہ سے نمایاں ہیں۔ وجہی ابراہیم قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں گذرا ہے اس کی مثنوی "قطب مشتری" ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ہم اس کی ایک غزل کے چند شعر درج کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں:۔

طاقت نہیں دوری کی اب توں ہیگی آمل رے پیا
تج بن منج جینا بہوت ہوتا ہے مشکل رے پیا
کھانا برہ کیتی ہوں میں پانی رنجھو پیتی ہوں میں
تج سے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل رے پیا
ہردم توں یاد آتا منج اب عیش نہیں بھاتا منج
برھا لو سنتا نا منجے تج باج تل تل رے پیا

دوسرا مشہور شاعر غواصی سلطان محمد قطب شاہ کے زمانہ میں گذرا ہے۔ اس کی غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

پیا بن پیالہ پیا جائے نا
پیا باج تک تل جیا جائے نا
سجن یوں میرا مجہ سوں بیدل ہوا
ہر یک تل مجھے یوں کتا جائے نا
غواصی نہ دے توں دیوانے کو پند
دیوانے کون پند دیا جائے نا

عادل شاہی

عادل شاہی دور میں یوں تو بہت سے حکمران شاعر گذرے ہیں خصوصاً ابراہیم عادل شاہ ثانی کی "نورس" زیادہ مشہور ہے لیکن اُن کی غزل گوئی کے چرچے نہیں البتہ علی عادل شاہ ثانی جو اس سلسلہ کا آٹھواں بادشاہ تھا صاحب دیوان گذرا ہے اور اس کا نایاب کلیات دستیاب ہوا ہے

ان کا تخلص شاہی تھا اور اس کلیات میں جو غزلیں درج ہیں ان کا نمونہ درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

سارے جہاں کے پار کھی پر کھوں رتن کیونکر کہو
یاقوت ہوا مرجان میں کوہی رتن بر تر کہو
مرجان میں صافی نہیں یاقوت میں صافی اچھے
جس ذات میں صافی اچھے اس ذات کوں بہتر کہو
یاقوت ہوا مرجان کی شاہی لکھیا ساری غزل
سن کر جگت کے شاعران اس شعر کوں افسر کہو

نصرتی اس دور کا بڑا شاعر ہے۔ اس کا نام محمد نصرت اور تخلص نصرتی تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت شاہی محل میں علی عادل شاہ کے ساتھ ہوئی اور اُن کی بادشاہت کے زمانہ میں عروج حاصل ہوا۔ اس کی مثنویاں بہت مشہور ہیں غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

مغرور ہے بے خبر دسوں مدن کی بالی
عالم کے جیو لینے لوچن میں ہے سو لالی
اس خام سن میں دیکھو کیا پختگی ہے فن میں
دینے کو وصل کاہل لینے کو جیو اتالی
برھی کے نس میں انجم سوں جلتا ہوں شمع تمنے
دکھلاجا درس کا رے خاور جمالی

ولی اور ان کے معاصرین

اردو غزل کی ابتدا ہوئے کافی عرصہ گذر گیا تھا لیکن زبان میں ابھی پختگی کے آثار پیدا نہ ہوئے تھے اس لئے شاعری بھی جس طرح چاہیئے تھی ترقی نہ کر سکی۔ خصوصاً غزل کا میدان چونکہ بہت تنگ واقع ہوا ہے اور جب تک زبان اور بیان پہ

پوری قدرت نہ ہو شاعر دو مصرعوں میں اپنا مافی الضمیر سمجھا نہیں سکتا اس لئے غزل گو ابھی منتِ پذیر شانہ تھے۔

اورنگ آباد میں وَلی کی پیدائش اُردو غزل میں ایک بڑا انقلاب ہے۔ وَلی فطرتاً شاعر تھا اور وہ بھی غزل گو۔ اُس نے زبان میں وہ خوبی پیدا کرلی کہ جس کی بدولت غزل گوئی کا میدان آسانی سے طے کیا جا سکتا تھا۔

تعلیم کے لئے وہ گجرات گیا اور ایک عرصہ قیام کے بعد جب اورنگ آباد لوٹا ہے تو اس کا دماغ غزل گوئی کے لئے بہت زیادہ موزوں تھا۔ شمالی ہند کے اس نے دو سفر کئے اور اپنا کلام دلّی اور گرد و نواح میں اِس طرح پیش کیا کہ وہ شعراء جو اُردو کو بے حیثیت اور کم مایہ زبان سمجھتے تھے اور اس میں شعر کہنا اپنے فن کے کمال کی تذلیل خیال کرتے تھے۔ وَلی کے کلام سے اِس درجہ متاثر ہوئے کہ اُنھوں نے بھی اُردو میں شعر کہنے کی ٹھان لی۔

شمالی ہند میں اُردو زبان میں شعر گوئی کا مذاق پیدا کرنے کا سہرا وَلی ہی کے سر ہے اور یہی وہ تاریخی واقعہ ہے کہ جس کے بعد سے صحیح معنوں میں اُردو شاعری کا عروج ہوا۔ کیونکہ علماء و فضلاء یا فارسی کے متند شعراء جب اُردو میں طبع آزمائی کرنے لگے تو یہ یقینی تھا کہ اِس کس مپرسی کے عالم میں پڑی ہوئی نوزائیدہ زبان کو ایک ایسا سہارا میسر آیا کہ جس کے بل بوتہ پر پروان چڑھنے ہی

غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

خوب رُو خوب کام کرتے ہیں
یک نگہ میں غلام کرتے ہیں
دیکھ خوباں کوں وقت ملنے کے
کس ادا سوں سلام کرتے ہیں
کیا وفادار ہیں کہ ملنے میں
دل سوں سب رام رام کرتے ہیں
کم نگاہی سوں دیکھتے ہیں وَلی
کام اپنا تمام کرتے ہیں
کھولتے ہیں جب اپنی زلفاں کوں
صبح عاشق کوں شام کرتے ہیں
صاحب لفظ اس کوں کہہ سکیئے
جس سوں خوباں کلام کرتے ہیں
دل لیجاتے ہیں اَے وَلی میرا
سرو قد جب خرام کرتے ہیں

وَلی کی غزل گوئی نے شمالی ہند کے باکمال شاعروں کو بھی اِس میدان میں لا کھڑا کیا اور وہ جو فارسی کی لکیر پیٹتے تھے اَب اُردو کی طرف مائل ہونے لگے۔

شاہ حاتم کی طبیعت موزوں تھی اور جب انھوں نے اُردو کا بول بالا دیکھا تو خود بھی شعر کہنے لگے۔ پہلے رمز تخلص کرتے تھے اِس کے بعد حاتم ہو گئے۔ اُن کا کلیات بہت بڑا ہے لیکن اُنھوں نے جو خود انتخاب کیا ہے اِس مجموعہ کا نام "دیوان زادہ" رکھا۔

…رانہ اور عاشقانہ رنگ میں غزلیں کہیں اور صاف اور شستہ زبان کا زیادہ خیال رکھا۔ اپنے وقت کے اُستاد مانے جاتے تھے اور اُن کے شاگردوں میں کم و بیش ۴۵ شعراء شامل ہیں جن میں مرزا رفیع سودا بھی داخل ہیں۔ بڑی عمر پائی اور ایک

عرصہ دراز تک اردو غزل کی مشاطگی کرتے رہے۔

نمونہ کے طور پر غزل ملاحظہ ہو:۔

آب حیات جاکے کسو نے پیا تو کیا
مانند خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا
شیریں بیاں سوں سنگ دلوں کو اثر نہیں
فرہاد کام کوہ کنی کا کیا تو کیا
جلنا لگن میں شمع صفت سخت کام ہے
پروانہ جوں شتاب عبث جی دیا تو کیا
محتاجگی سوں مجھکو نہیں ایک دم فراغ
حق نے جہاں میں نام کو حاتم کیا تو کیا

اسی دور کے ایک باکمال شاعر خان آرزو ہیں۔ اکبرآباد وطن تھا لیکن دلی سے بہت اُنس تھا۔ اس لئے یہیں کے ہو رہے اور گو کہ لکھنو میں ۱۱۶۹ھ میں انتقال کیا مگر دلی ہی میں سپرد خاک ہوئے۔ ان کی غزلوں کے بعض متفرق اشعار درج ذیل ہیں:۔

مغاں مجھ مست بن پھر خندہ قلقل نہ ہووے گا
مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا

رکھے ہیں پارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے
چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

یہ ناز یہ غرور لڑکپن میں تو نہ تھا
کیا تم جوان ہو کے بڑے آدمی ہوئے

اسی رنگ تغزل کو مظہر جان جاناں نے تقویت پہنچائی اُن کے والد اورنگ زیب کے دربار میں صاحب منصب تھے اس لئے ۱۱ رمضان ۱۱۱۱ھ میں جبکہ اُن کی ولادت مالوہ میں ہوئی تو اورنگ زیب نے جان جانان نام تجویز کیا۔ اگرچہ کہ ان کے والد نے شمس الدین نام رکھا لیکن شہرت جان جاناں کے نام ہی سے ہوئی مظہر تخلص کرتے تھے۔

باپ کے انتقال کے بعد عزلت نشین ہوگئے۔ ہزاروں اصحاب مرید ہوئے اور اپنا دل بہلانے کی خاطر شاعری شروع کی۔ اکثر اوقات میں اُن کا تکیہ مشاعرہ کا قایم مقام ہوتا تھا اور اُن کے شاگرد اور دوسرے ملنے ملانے والے طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ نمونہ کے طور پر ایک غزل درج ذیل ہے:۔

چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزہ سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا
رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی
مجھے ناحق ستاتا ہے یہ عشق بدگماں اپنا
کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو ہے ظالم
کہ دولت خواہ اپنا مظہر اپنا جانِ جاں اپنا

سودا، میر اور ان کے معاصرین

اردو غزل گوئی نے اس دور میں نیا رنگ اختیار کیا۔ سودا اور میر نے غزل میں اپنی اُستادی کے جوہر دکھائے اور یہ حقیقت واضح کردی کہ دو مصرعوں میں بھی شاعر باکمال کیا کیا مضمون آفرینی کرسکتا ہے۔

مرزا محمد رفیع سودا ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے اور

دِلّی میں تعلیم و تربیت پائی۔ طبیعت شعرگوئی کے لئے موزوں تھی جس صنف میں طبع آزمائی کی کمال دکھایا۔ الفاظ پر قدرت، زورِ بیان اور جدت طرازیاں سوداؔ کی خصوصیات ہیں اور حق یہ ہے کہ اُن ہی کی پُرشوکت ترکیبوں اور چُست بندشوں نے اُردو غزل کا بول بالا کر دیا۔

مشہور عالی دماغ و نازک مزاج شاعر شیخ علی حزیں کے آگے کسی نے سودا کو پیش کیا اور اُن کی شاعری کی تعریف بھی لگے ہاتھوں کر دی۔ حزیں نے سوداؔ کو کلام سُنانے کے لئے کہا اُنھوں نے اپنی مشہور غزل کا مطلع پڑھا:-

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مُرغ قبلہ نُما آشیانہ میں

شیخ نے دریافت کیا تڑپے چہ معنی دارد۔ سودا نے کہا اہل ہند طپیدن را تڑپنا می گویند۔ شیخ نے شعر دوبارہ پڑھوایا اور کہا مرزا رفیع قیامت کردی یک مُرغ قبلہ نما باقی بود آنرا ہم نگذاشتی۔ یہ کہکر اُٹھے اور بغلگیر ہوئے بعض کہتے ہیں کہ شیخ نے کہا "در پوچ گویان ہند بد نیستی"

جس غزل کا مطلع اُوپر درج کیا گیا ہے اُسی کے بعض شعر نمونہ کلام کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں:-

کیونکر نہ چاک چاک گریبان دل کروں
دیکھوں جو تیری زلف کو میں بیت شانہ میں
دست گرہ کشا کو نہ تڑپیں کر فلک
مہندی بندھی نہ دیکھی ہیں انگشت شانہ میں
سوداؔ خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے میں

اُردو شاعری پر مرزا کا احسان ہے کہ اُنھوں نے اس زبان میں شعر گوئی کا ذوق عام کیا چنانچہ خود کہتے ہیں

سخن کو ریختی کے پوچھے تھا کوئی سوداؔ
پسند خاطر دلہا ہوا یہ فن مجھ سے
کب اس کو گوش کرے تھے جہاں میں اہل کمال
یہ سنگریزہ ہوا ہے دُرِ عدن مجھ سے

اُنھوں نے فارسی سے بکثرت الفاظ و محاورات، استعارے اور تشبیہیں، طرز تخیل، اور تلمیحات زبان اُردو میں داخل کئے اور اس اُستادی سے داخل کئے کہ وہ اس کے جزو بن گئے۔

وَلیؔ اورنگ آبادی کو اگر اُردو زبان کا چاسر کہا جا سکتا ہے تو سوداؔ کو بھی یقیناً اسپنسر تسلیم کیا جا سکتا ہے میرؔ جیسے نازک دماغ نقاد نے سوداؔ کو پورا شاعر مانا ہے اور ملک الشعراء کے خطاب کا مستحق قرار دیا ہے۔

۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء میں وفات پائی۔

میر تقی میرؔ اُردو غزل کے مسلم الثبوت اُستاد سمجھے جاتے ہیں معاصرین اور متاخرین دونوں نے اُن کا لوہا مانا ہے۔ ناسخؔ نے کہا۔ ع

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

غالبؔ کو اعتراف ہے کہ ؎

ریختہ کے تم ہی اُستاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میرؔ بھی تھا

خود میرؔ صاحب اپنے کمال سے واقف تھے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

سارے عالم پہ ہوں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اُن کے اشعار صاف، سادہ اور فصیح زبان میں ہیں۔ دلکشی اور زورِ بیان کوٹ کوٹ کر اُن میں بھرا ہے۔ اظہارِ جذبات پر وہ اِس قدر قادر ہیں کہ اُنکی زبان سے نکلا ہوا شعر دل کی گہرائیوں کا آئینہ دار ہوتا ہے یہی اُن کا وہ طرۂ امتیاز ہے جس کے سبب سے اُن کا ہر ہر شعر ایک ایک نشتر کا کام کرتا ہے۔

میر صاحب کا پورا کلام سوز و گداز، حزن والم اور یاس و اضطراب میں ڈوبا ہوا ہے۔ اندازِ بیان کچھ اِس قدر حقیقت آشنا ہے کہ تصنع اور ظاہرداری کا شبہ تک نہیں گذرتا اور صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی چوٹ کھائے ہوئے دل کی سچی ترجمانی ہے۔ اسی خصوصیت کی بنا پر بعض نقادوں نے اُن کے کلام سے بہتر نشتر منتخب کرلئے اور اُن کو میر کی شاعری کی ساری پونجی قرار دیا۔

میر بہت پرگو شاعر تھے اور اُنھوں نے تمام اصناف سخن میں اپنا کلام چھوڑا ہے۔ شاعری کے علاوہ نثر میں بھی بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں اُن میں خود نوشت سوانح حیات ذکر میر اور ایک تذکرہ موسوم بہ "نکات الشعراء" زیادہ مشہور ہیں۔ اور اسی بسیار گوئی کے باعث اُن کے کلام میں یکسانیت باقی نہیں رہ سکی اور وہ جو کہا جاتا ہے کہ "بلندش بغایت بلند و پستش بغایت پست" بالکل صحیح ہے۔

غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا! اس بیماری دل نے آخر اپنا کام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اُس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا
میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

میر اور سودا کے موازنہ کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ میر کا کلام "آہ" ہے اور سودا کا "واہ"۔ چونکہ غزل کی جان "آہ" ہوتی ہے اس لئے اِس میدان میں میر، سودا کے آگے ہیں لیکن دوسری اصناف مثلاً قصیدہ جہاں کہ شوکتِ الفاظ اور چست بندشوں کے ساتھ ساتھ مضامین میں تنوع اور بلند پروازی کی ضرورت ہے بلا شبہ سودا میر سے پیش پیش دکھائی دیتے ہیں۔

میر صاحب کی وفات ۱۲۲۵ھ میں ہوئی اور ناسخ کے حسب ذیل مصرع سے تاریخ نکلتی ہے ع

واویلا مُرد شہ شاعران

اسی دور کے تین اور شاعر قابل ذکر ہیں۔ ایک درد، دوسرے اثر اور تیسرے سوز۔ سوز کا نام سید محمد تھا پہلے میر تخلص کرتے تھے اور بعد میں جب میر تقی کا غلغلہ بلند ہوا تو میر چھوڑ کر سوز تخلص کرنے لگے۔ کلام میں صفائی اور روزمرہ کا چٹخارہ ہے۔ اُن کا رنگ تغزل شیریں کلامی

کی وجہ سے زیادہ مقبول ہوا اُن ہی کو میر تقی نے پاؤ شاعر کہا ہے۔ اثرؔ کا نام بھی سید محمد تھا اور یہ خواجہ میر دردؔ کے بھائی تھے۔ اُن کی غزلوں پر تصوف کا رنگ غالب ہے، اور جو کہتے خدا لگتی کہتے۔

خواجہ میر دردؔ میرؔ اور سوداؔ کے بعد اپنے ہم عصروں میں بلند پایہ شاعر تھے۔ اُن کو میرؔ صاحب نے آدھا شاعر تسلیم کیا ہے۔ اُن کے خیالات میں سنجیدگی اور متانت کوٹ کوٹ کر بھری ہے کبھی نہ کسی کی ہجو کہی اور نہ کبھی قصیدہ کسی کی شان میں موزوں کیا۔ اُن کا سارا کلام تصوف کی چاشنی کی وجہ سے نمایاں ہے اور مُبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ اِس موضوع پر جس عمدگی سے اُنھوں نے قلم اُٹھایا ہے بہت کم اُردو شاعروں نے اُسے بنا ہا ہے۔

چھوٹی بحروں میں علی الخصوص اُن کی غزلیں خوب چمکی ہیں:-

تہمتیں چند اپنے ذمے دَہر چلے
جس لئے آئے تھے سو ہم کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مَر چلے
شمع کی مانند ہم اِس بزم میں
چشمِ تر آئے تھے دامن تر چلے
ڈھونڈتے ہیں آپ سے اس کو پَرے
شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
دَردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف آئے تھے کدھر چلے

انشاؔ اور اُن کے معاصرین

سید انشا اللہ خاں انشاؔ میر ماشاء اللہ خاں کے فرزند تھے۔ مُرشد آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ شاہ عالم کے زمانہ میں دِلّی آئے اور توقع کے مطابق اُن کی دربار میں قدر کی گئی۔

گو دِلّی میں میرؔ و سوداؔ تو نہیں تھے لیکن ابھی بہت سے ایسے بڈھے موجود تھے جنھوں نے اِن اُستادوں کی آنکھیں دیکھی تھیں اور اِسی سبب سے وہ اپنے آپ کو نقادِ فن خیال کرتے تھے۔ بھلا انشاؔ کو یہ کب گوارا تھا کہ کوئی اُن کے کلام پر حرف گیری کرے وہ شوخ اور چنچلی طبیعت کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی رعونت اپنی طبیعت میں محسوس کرتے تھے اور اِسی وجہ سے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔

بہت جلد اپنی اُفتادِ طبیعت سے مجبور ہو کر اُنھوں نے دِلّی میں شاعروں کو اکھاڑا بنا دیا جہاں سخت سے سخت تنقیدوں اور دل آزار اعتراضات کے ہتھیار پہلوانانِ سخن اِستعمال کرتے تھے جب معرکہ آرائیاں اُن کے اِختیار سے باہر ہو گئیں تو اُنھوں نے لکھنؤ کا رُخ کیا اور اپنی بذلہ سنجی اور ظرافتِ طبع کے باعث مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں رُسوخ پیدا کر لیا۔ یہاں مصحفیؔ اور اِنشاؔ میں جو زور آزمائیاں ہوئیں وہ تاریخ ادب میں ایک مسابقت کے باب کا اضافہ کرتی ہیں۔

کچھ عرصہ بعد نواب سعادت علی خاں کے ہاں ملازم ہوگئے
شروع شروع میں اُن کا طوطی خوب بولتا رہا لیکن تابکے
بسیار گوئی کے سبب جو منہ میں آیا کہہ جاتے تھے اور
دراصل اسی بے احتیاطی کی وجہ سے نواب سے تعلقات
خراب ہوئے اور آخر عمر میں بہت سی تکلیفیں اُٹھائیں
اور مصیبتیں برداشت کیں

اِنشاء کو کئی زبانوں میں دخل تھا اور اُردو کی
صرف و نحو کے تو مسلم الثبوت اُستاد تھے مگر طبیعت میں
متانت، وقار، اور سنجیدگی نہ تھی اور اسی باعث سے
اکثر لغزشیں بھی ہوگئیں لیکن اُن کے اسباب کم علمی
نہیں بلکہ زیادہ گوئی، فی البدیہ اور شوخی طبع تھے۔
اُن کی جدت آفریں طبیعت نے ریختی کو خوب رواج دیا
اور اس میں اتنی صلاحیت پیدا کر دی کہ وہ بذاتہٖ ایک
مقبول صنف ہوگئی۔

اِنشاء کی خصوصیات میں انداز بیان پر کامل قدرت
قوتِ ایجاد و اختراع، حاضر جوابی اور ظرافت، موزونی
طبع اور متعدد زبانوں پر تصرف قابل ذکر ہیں۔ اُنھوں
نے زبان کو وسیع کرنے اور مختلف اصناف سخن کو
ہر دلعزیز کرانے کی جو کوشش کی وہ ہر طرح سے مشکور رہے۔

ذیل کی غزل زبان زد خاص و عام ہے:۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دُھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں
بسان نقش پائے رہروان کوئے تمنا میں
نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے اُفتادگی سے اَب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے اِنشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

اِنشاء کا انتقال ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ء میں ہوا۔

شیخ قلندر بخش جرات کا بچپن فیض آباد میں گذرا
لیکن ۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ چلے آئے اور مرزا سلیمان
شکوہ کے ہاں ملازم ہوگئے۔ کچھ زیادہ پڑھے لکھے
نہ تھے لیکن طبیعت بہت موزون تھی جعفر علی حسرت
کے شاگرد ہوئے اور اپنی طبیعت کی افتاد سے واقف
ہو کر غزلگوئی ہی کی طرف پوری توجہ کی۔ اصلی رنگ
تغزل یعنی عشق و محبت کی داستان کو کچھ اس انداز
میں نمک مرچ لگا کر بیان کیا کہ ایک خاص بانکپن
اُن کی غزلوں میں نمایاں ہوا۔ اُن کا معشوق حقیقی
نہیں بلکہ مجازی ہوتا تھا اور جذبات کا اظہار بھی مادی
اس لئے یہ رنگ عوام میں بہت مقبول ہوا اور عوام
کے علاوہ عیش پسند نوابوں کو بھی یہ طرز پسند آئی
اس لئے خوب خاطر و مدارات ہوئی۔

جرات اسی رنگ تغزل کے موجد کہے جاسکتے
ہیں جو بعد میں داغ کے ہاتھوں عروج پایا۔ سیدھے
سادے الفاظ میں جذبات کی ترجمانی اور وصال و
فراق کے مطالب کو نئے نئے اسلوب میں بیان کرنا
اُن کی وہ خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے اچھے اچھے

مشاعروں میں اُن کی غزلیں خوب چمکیں۔

غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں
ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں

پہلو میں کیا کہیں جگر و دل کا کیا ہے رنگ
کس روز اشک خونی سے تر آستیں نہیں

فرصت جو پا کے کہیئے کبھی درد دل تو ہائے
وہ بدگماں کہے ہے کہ ہم کو یقیں نہیں

آنکھوں کی راہ نکلے ہے کیا حسرتوں سے جی
وہ رو برو جو اپنے دم واپسیں نہیں

حیرت ہے مجھکو کیونکہ وہ جرأت ہے چین سے
جس بن قرار جی کو ہمارے کہیں نہیں

جوانی میں جرأت اندھے ہوگئے تھے اور اُسی حال میں ۱۲۲۵ھ میں انتقال کیا۔

شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے والد کا نام ولی محمد تھا امروہہ کے رہنے والے تھے۔ آغاز جوانی میں ۱۱۹۰ھ میں دلی آگئے۔ ایک عرصہ تک یہیں رہے اور اپنے اس قیام پر فخر و مباہات کیا کرتے تھے۔ بارہ برس دلی میں رہکر لکھنو کا رُخ کیا۔ اس زمانہ میں دلی سے ارباب علم و اَدب سب یکے بعد دیگرے لکھنو چلے گئے تھے کیونکہ دلی میں قدر دانان سخن اور سرپرست باقی نہ رہے تھے۔ لکھنو میں مثل دوسرے شعراء کے مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم ہوگئے۔ لیکن ایک عرصہ بعد جب انشا نے مقابلہ پر کمر کس لی تو لکھنو میں اُن کی شمع ٹمٹمانے لگی اور دلی جس کو اُنھوں نے خود چند سال پیشتر "اُجڑا دیار" کہا تھا آگئے۔ طرز قدیم میں اُنھیں سودا اور میر کا آخری ہم زبان سمجھنا چاہیئے۔ وہ انشا اور جرأت کی نسبت دیرینہ سال تھے۔ یا تو بڑھاپے نے پرواز کے باز و ضعیف کر دیئے تھے یا قدامت کی محبت نے تخیل کی طرف متوجہ نہ کیا۔ گو کہ کہتے وہی تھے جو اوروں نے کہا ہے لیکن طرز ادا اور اسلوب بیان بہت دل پسند تھا اُس پر کہنہ مشقی اور طبیعت کی جولانی سونے پر سہاگہ تھی سخت سے سخت زمینوں میں لمبی سے لمبی غزل کہدینا اُن کے لئے کچھ مشکل نہ تھا اور یہ جوہر اُس وقت خوب ہی چمکا جبکہ انشا نے اعتراضات کے تیر چلائے اور طعن و تشنیع کے حربے استعمال کئے۔ اعتراضات کو رد کرنے اور اپنے آپ کو اُستاد منوانے کے لئے مصحفی نے بھی خوب زور مارا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ مصحفی بھی اپنے وقت کے اُستاد تھے۔ اُن کے شاگردوں میں بہت سے شعراء بعد میں بہت چمکے جن میں آتش، ضمیر، خلیق، وغیرہ تھے ناسخ کو بھی آپ کے ایک شاگرد سے تلمذ حاصل تھا۔

مصحفی اپنے ہم عصر انشا کی طرح بہت پُرگو شاعر تھے اور عسرت و تنگ حالی نے اس میں اور بھی ضرورتاً زیادتی کی مشاعروں میں جو مصرع طرح دیا جاتا اُس پر بیسیوں شعر کہتے اور تھوڑے تھوڑے اپنے کرم فرماؤں کے ہاتھوں قیمتاً فروخت کر دیتے۔

نمونہ کی غزل درج ذیل ہے:۔

سر شام اُس نے مُنہ سے جو رُخ نقاب اُلٹا
نہ غروب ہونے پایا وہیں آفتاب اُلٹا

مہ چاردہ کا عالم میں دکھاؤں گا فلک کو
اگر اُس نے پردہ مُنہ سے شب ماہتاب اُلٹا

جو خیال میں کسو کے شب ہجر سو گیا ہو
نہ ہو صبح کو الٰہی کبھی اس کا خواب الٹا
کہیں چشم مہر اس پر تو نہ پڑ گئی ہو یا رب
جو نکلتے صبح گھر سے وہ پھرا شتاب الٹا
نہیں جائے شکوہ اُس سے ہمیں مصحفی ہمیشہ
کہ زمانہ کا رہا ہے یوں ہیں انقلاب الٹا

۱۲۴۰ھ میں انتقال کیا۔

ناسخ، آتش اور اُن کے ہمعصر

شیخ امام بخش ناسخ کو عام طور پر پہلوان سخن کہا جاتا ہے کیونکہ ایک طرف تو وہ شاعری میں اُستادی کا درجہ رکھتے ہیں اور دوسری طرف جسمانی اعتبار سے بھی وہ پہلوان تھے۔ دن بھر دوست احباب اور شاگردوں سے ملتے ملاتے اور رات کے اول حصہ میں سو رہتے۔ نصف شب سے فکر شعر کرتے اور صبح کے قریب ورزش میں مصروف ہو جاتے۔ دن میں ایک ہی دفعہ دوپہر میں کھانا کھاتے جس کی مقدار پانچ سیر سے کم نہوتی۔

خاندانی حالات اور سلسلہ شاگردی کے متعلق تفصیلات معلوم نہیں ہو سکے۔ لیکن اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ قدردانوں اور سرپرستوں کی بدولت آرام و اطمینان سے دن گذارتے تھے۔ اُن کے عہد میں دلّی اُجڑ چکی تھی اور ادبا و شعرا کا مجمع لکھنؤ میں ہو رہا تھا۔

ناسخ کی وضعداری نے غزلگوئی کا ایک نیا میدان ڈھونڈھ نکالا جو لکھنؤ اسکول کے نام سے شہرت پایا جس میں شعر کے حُسن ظاہری اور رعایت لفظی اور ضایع و بدایع کا خیال زیادہ رکھا جاتا تھا۔

اُن کی غزلیں شاندار الفاظ اور طرح طرح کی تشبیہات کا مجموعہ ہیں اور یہی دو خصوصیات اُن کے سارے کلام میں زیادہ نمایاں ہیں۔ عربی اور فارسی کے پُرشوکت الفاظ، نئی نئی بندشیں اور شاندار ترکیبیں بعض دفعہ اُن کی غزلوں کو بہت بلند کرتی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ شعر محض الفاظ کا گورکھ دھندا ہو کر رہ جاتا ہے اور معنی خبط ہو جاتے ہیں۔ اسیطرح تشبیہات اور استعاروں کا خیال بھی عمدہ سے عمدہ مضمون باندھنے نہیں دیتا۔ نازک خیالی اُن کی غزلوں کی روح رواں ہے۔

ذیل کی غزل اُن کے کلام کا بہترین نمونہ ہے:

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے اپنے گریباں کا
ازل سے دشمنی طاؤس و مار آپس میں رکھتے ہیں
دل پُر داغ کو کیونکر ہے عشق اُس زلف پیچاں کا
کفن کی جب سفیدی دیکھتا ہوں کنج مرقد میں
تو عالم یاد آتا ہے شب مہتاب ہجراں کا
شگفتہ فصل گل میں مثل گل ہر زخم ہوتا ہے
بنا ہے کیا ہمارا، کالبد خاک گلستاں کا
تہ شمشیر قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ
کہ عالم ہر دہان زخم پر تھا روئے خنداں کا

۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء میں انتقال کیا۔

خواجہ حیدر علی آتش دلّی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے والد علی بخش نے فیض آباد میں سکونت اختیار کر لی اور یہیں آتش پیدا ہوئے۔

بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اس لئے تعلیم و تربیت اچھی نہ ہو سکی۔ نواب مرزا محمد تقی کے ملازم ہو کر لکھنو آئے اور یہاں شعر و شاعری کا بازار گرم دیکھ کر شعر کہنے کو جی چاہا۔ مصحفی کا اس عہد میں طوطی بولتا تھا اسلئے اُن کے شاگرد ہوئے اور فکر سخن میں اتنا جی لگایا کہ بہت جلد صاحب طرز ہو کر اُستادی کا درجہ حاصل کر لیا۔

طرز کلام میں اپنے ہم عصر ناسخ سے بالکل ہی جدا تھے۔ وہاں شان و شوکت تھی تو یہاں سادگی۔ سیدھے سادے الفاظ میں اور سلیس پیرایہ میں اظہار مطلب کرتے تھے اور کبھی بال کی کھال نہ کھینچتے تھے دراصل یہی متضاد کیفیتیں تھیں جن کے باعث دونوں ہم عصر ایک دوسرے کے حریف ہو کر میدان شعر میں زور آزمائی کرتے تھے۔ لیکن اُن کے مقابلوں کا رنگ عامیانہ اور سوقیانہ نہ ہوا تھا اور مثل انشاء، جرأت اور مصحفی کے ابتذال کی نوبت نہ پہنچی تھی۔

اُن کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت روانی ہے اور اسی وجہ سے اثر زیادہ ہوا اور اثر ہی کی بدولت عوام و خواص میں قبولیت کا مرتبہ پایا۔ آج ناسخ کا طرز متروک ہے مگر آتش کے پیرو نظر آتے ہیں۔

نمونہ کے لئے ذیل کی غزل ملاحظہ ہو:۔

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھکو خلق خدا غائبانہ کیا

زیر زمین سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا

کیا کیا اُلجھتا ہے تری زلفوں کے تار سے
بخیہ طلب ہے سینہ صد چاک شانہ کیا

چاروں طرف سے صورت جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئنہ خانہ کیا

یاں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

غالب اور ان کے معاصرین

غالب اور اُن کے معاصرین، ذوق

اور مومن کا دور اُردو غزل گوئی کی معراج کا زمانہ خیال کیا جاتا ہے کیونکہ سوائے سودا اور میر کے عہد کے کسی زمانہ میں آسمان غزل پر اتنے زیادہ درخشندہ تارے طلوع نہ ہوئے تھے۔ غالب کے کلام کو جو قبولیت حاصل ہوئی وہ ہندوستان کے کسی شاعر کو نصیب نہ ہوئی۔ مومن اور ذوق کا بھی چوٹی کے شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔

ایک عرصہ سے دلی تاراج ہو چکی تھی اور لکھنو شعر و شاعری کا مرکز بنا ہوا تھا لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اُردو کے یہ تینوں بڑے شاعر نہ صرف ایک ہی وقت میں شاعری کی زلف گرہ گیر کی مشاطگی کرتے رہے بلکہ ایک ہی مقام یعنی دلی میں ہمنوا ہوئے۔

غالب کا نام مرزا اسد اللہ خاں تھا۔ ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۶ء میں بہ مقام آگرہ پیدا ہوئے۔ لقب مرزا نوشہ تھا اور خطاب نظام جنگ نجم الدولہ دبیر الملک پہلے اسد تخلص کرتے تھے پھر غالب اختیار کیا۔ خاندانی سلسلہ افراسیاب بادشاہ توران سے ملتا ہے۔ ان کے دادا شاہ عالم کے زمانہ میں ہندوستان آئے۔ اُن کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں کچھ دنوں دربار اودھ میں رہے

پھر نواب نظام علی خاں بہادر کے عہد میں حیدرآباد دکن آئے اور یہاں ایک لڑائی میں ۱۲۱۷ھ میں مارے گئے۔ مرزا کی عمر اس وقت پانچ برس کی تھی اور وہ چچا کے ہاں چلے آئے جو انگریزی فوج میں ملازم تھے۔ فوجی خدمات کے صلہ میں اُن کے خاندان کو جاگیر عطا ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد جاگیر ضبط ہو کر پنشن ملتی تھی مگر یہ بھی آخر عمر تک باقی نہیں رہی۔ مرزا کو دربار رامپور سے ماہوار مقرر تھی اور بہادر شاہ کے ہاں سے بھی کچھ ملتا تھا مگر مرزا بہت مسرف واقع ہوئے تھے اس لئے آخر وقت تک تنگ حال رہے ۷۳ سال کی عمر میں ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء میں دہلی میں انتقال کیا۔

مرزا کے سب بچے نوعمری ہی میں انتقال کر گئے اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کو اپنا لڑکا سمجھتے تھے اور اسی طرح محبت کرتے تھے عارف نے بھی جوانی میں دُنیا سے منہ موڑا۔

فطرتاً مرزا نہایت شگفتہ مزاج، بذلہ سنج، اور وضعدار انسان تھے۔ ہمیشہ دوستوں کی صحبت میں وقت کٹتا تھا۔ اور دوست بھی ایسے جو ان پر جان چھڑکیں اور یہ اُن پر۔

مرزا کے شاگردوں میں نواب ضیاء الدین خاں نیّر و رخشاں، میر مہدی مجروح، مرزا قربان علی بیگ سالار خواجہ الطاف حسین حالی، منشی ہرگوپال تفتہ، نواب علاء الدین خاں علوی، زکی، عزیز، مشتاق، جوہر وغیرہ مشہور ہیں۔ تصانیف میں قابلِ ذکر عودِ ہندی، اُردوئے معلّٰی، قاطع برہان، مہر نیم روز، نامہ غالب، تیغ تیز، لطائف غیبی، پنج آہنگ وغیرہ ہیں۔ جدید نثر اُردو کے موجد خیال کئے جاتے ہیں۔ اور اُن کے خطوط میں ایک خاص بانکپن ہے۔ فارسی تو اُن کی زبان ہی تھی اور اسی کو مایۂ نازش سمجھتے تھے اس لئے فارسی نظم و نثر پر قدرت حاصل کرنا اُن کے لئے مشکل نہ تھا۔ گو کہ فارسی کلام بےنظیر ہے لیکن اُن کے اُردو دیوان کو جو قبولیت حاصل ہوئی وہ کسی اور کے کلام کو نہیں ہوئی۔

غالب کے کلام کی پہلی خصوصیت جدت پسندی ہے۔ تشبیہات، تخیل، طرزِ ادا، استعارات، محاکات ترکیبیں و بندش غرض یہ کہ ہر چیز میں غالب کے ہاں جدت ہی جدت ہے۔ پرانی لکیر پیٹنا، اور چبائے ہوئے لقموں کو چبانا غالب کو سخت ناپسند تھا۔ یہ عادت نہ صرف شاعری ہی کی حد تک رہی بلکہ روزمرہ کی زندگی میں بھی ان کی طبیعت ثانی بن گئی۔ دوسری خصوصیت اُن کا فلسفیانہ رنگ ہے۔ نہ اِن سے پہلے اور نہ اِن کے بعد کسی نے "تنگ نائے غزل" میں فلسفیانہ خیالات کا اتنا طومار باندھا۔ فارسی غزل میں یہ رنگ نیا نہیں غالب نے دراصل وہیں سے اس طرز کی خوشہ چینی کی اور اسی لئے اُن کے اکثر شعر یا تو فارسی کے اشعار کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں یا پھر اُن سے استفادہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ تیسری خصوصیت فارسی کی بندشوں اور ترکیبوں کو اُردو میں رواج دینا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدا ہی سے فارسی کے استعارے اور اسی کی ترکیبیں اُردو میں رائج تھیں لیکن غالب نے یہاں بھی اُپج کی لی اور اردو اور فارسی کا ایسا میل کیا اور اُن کو اس طرح سمویا کہ ایک نئی چیز پیدا ہوگئی۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ غالب اپنے زمانہ کے رنگ سے بالکل الگ تھلگ رہے۔ فضا اور

ماحول عام شعراء کو متاثر کرتے ہیں لیکن غیر معمولی شاعر کو اپنے رنگ میں نہیں رنگ سکتے۔ غالب کی شاعری اس گورکھدھندے سے پاک ہے جو اس عہد کی خصوصیت ہے۔ پانچویں خصوصیت غالب کی شوخی ہے۔ اُن کے اشعار میں ایک خاص قسم کا بانکپن، ایک نئی طرز کی شوخی اور ایک ہلکا سا مزاحیہ رنگ نظر آتا ہے ـــــ ایسا جو اُردو شاعری میں کہیں اور دکھائی نہیں دیتا۔

نمونہ کی غزل درج ذیل ہے:-

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہو پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا

ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اس دَور کے دوسرے بڑے شاعر مومن ہیں۔ کہتے ہیں کہ اُن کے گھر والوں نے حبیب اللہ نام رکھا تھا۔ لیکن شاہ عبدالعزیز نے مومن خاں نام تجویز کیا اور اسی نام سے مشہور ہوئے۔

اُن کے والد حکیم غلام نبی خاں شہر کے شرفا میں سے تھے خاندانی طبیب تھے اور اُن کے بعض بزرگ شاہی طبیب بھی رہ چکے تھے اسی صلہ میں جاگیر عطاء ہوئی تھی مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد سرکار انگریزی سے پنشن ملتی تھی۔

۱۲۱۵ھ کو دہلی میں کوچہ چیلان میں پیدا ہوئے شاہ عبدالقادر صاحب سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں پھر طب کی طرف رجوع ہوئے اور چچا کے مطب میں نسخہ نویسی کرنے لگے۔ اسی زمانہ میں نجوم کا شوق ہوا اور خاص مہارت پیدا کی۔

شاعری سے اُن کی طبیعت کو خاص مناسبت تھی ابتداء میں شاہ نصیر کو کلام دکھایا لیکن بہت جلد ہی اصلاح لینی چھوڑ دی اُن کی غزلوں میں ایک خاص بات ہے جو اُن کو صاحب طرز استاد بناتی ہے۔ استعارہ اور تشبیہ سے موزوں کام لیتے ہیں اور اشارے کنایے میں وہ وہ کہہ جاتے ہیں جو تفصیلات میں لُطف نہیں دیتا لیکن خوبی یہ ہے کہ خیالات کی بلندی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اس معاملہ میں انھوں نے کچھ ایسا عمدہ توازن قائم کیا کہ ناسخ کی سی پیچیدگیاں اُن کے کلام میں پیدا نہ ہوئیں فارسی ترکیبیں اور بندشیں جو اس دور کی ایک طرح سے خصوصیت ہو گئی تھی ان کے ہاں بھی ملتی ہیں مگر غالب کی سی کثرت نہیں ہے اس کے سوا تغزل کا لطف اُن کے ہاں زیادہ ہے اور اسی طرز کو نباہنے کی کوشش میں رنگ سخن کبھی کبھی جراءت کا سا ہو جاتا ہے۔

وضع داری اور خود داری کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو معاصرین کے مقابلہ میں زیادہ قابل سمجھتے تھے اسی وجہ سے اساتذہ سے کم بنتی تھی۔

نمونہ کی غزل ملاحظہ ہو:-

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس ماہی کی گُل شمع شبستاں ہوں گے
ناوک انداز جدھر دیدہ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے
تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے
تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہونگے
منت حضرت عیسیٰ نہ اُٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہوں گے
چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشین
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے
عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء میں انتقال ہوا۔

تیسرے بڑے شاعر ذوق ہیں۔ شیخ محمد ابراہیم نام تھا۔ اُن کے والد شیخ محمد رمضان سپاہی پیشہ تھے۔ ذوق ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ میں دہلی میں کابلی دروازہ کے پاس پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حافظ غلام رسول سے حاصل کی اور شاعری کے ابتدائی دور میں اُن ہی سے اصلاح لیتے تھے لیکن بہت جلد شاہ نصیر کے آگے زانوائے ادب تہ کیا۔

بہادر شاہ ظفر کو ولیعہدی کے زمانہ میں شاعری کا شوق ہوا تو دہلی کے اکثر باکمال شعراء دربار میں جمع ہوئے لیکن جب ذوق کی شہرت بڑھی تو ولیعہد ذوق کے شاگرد ہوئے۔ خاقانی ہند کا خطاب ملا۔ بڑے مذہبی اور پرہیزگار شخص تھے۔ چند روز موسیقی کا بھی شوق رہا اور نجوم و رمل بھی سیکھا۔

بڑے پرگو شاعر تھے۔ ابتداء میں مرزا رفیع سودا کا رنگ اُن کے کلام پر غالب رہا۔ وہی شوکت الفاظ اور ترکیبیں اور بندشیں لیکن یہ طرز قصیدوں میں زیادہ مقبول ہوئی۔ جب ذوق الٰہی بخش کے ساتھ رہے تو اُن کا رنگ عرفان اور تصوف ان کے کلام پر بھی اثر انداز ہوا۔ ظفر کی صحبت اور اُن کے کلام کو درست کرنے کے سلسلہ میں جراءت کا تغزل نمایاں ہوا۔ لیکن ان سب پر صفائی کلام ترکیبوں کی چستی، محاورے کی خوبی اور روزمرہ کا استعمال غالب رہا۔ سارے کلام میں یہ خصوصیات زیادہ نمایاں ہیں اور اسی وجہ سے ان کا کلام عام فہم اور قبولیت عامہ کا باعث ہوا۔

غدر سے کچھ پہلے اُن کے بیٹے اسمٰعیل نے ذوق کا کلام مرتب کرنا چاہا اور محمد حسین آزاد کو بھی اس کی فکر ہوئی کہ اسی اثنا میں ۱۸۵۷ء کا تہلکہ مچا لیکن آزاد، ذوق کے کلام کو مشکوں میں بھر کے حفاظت کرتے پھرے۔ اسی حفاظت کی وجہ سے ذوق کا کلام آج ہم تک پہنچ سکا ورنہ غدر کی نذر ہو جاتا۔

نمونہ کی غزل ملاحظہ ہو:۔

مزے یہ دل کے لئے تھے نہ تھے زباں کیلئے
سو ہم نے دل میں مزے سوزش نہاں کیلئے
فروغ عشق سے ہے روشنی جہاں کیلئے
یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کیلئے
نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شئے
عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کیلئے
نہیں ہے خانہ بدوشوں کو حاجت ساماں

اثاثہ چاہیئے کیا خانہ کماں کے لئے
اگر اُمید نہ ہمسایہ ہو تو خانۂ یاس
بہشت ہے ہمیں آرام جاوداں کیلئے
وبال دوش ہے اس ناتواں کو سر لیکن
لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لئے
بنایا آدمی کو ذوقؔ ایک جزو ضعیف
اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کیلئے

۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ کو سترہ دن بیمار رہ کر انتقال کر گئے کہتے ہیں کہ مرنے سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا ؎

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گذر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

نیا اردو ادب

وہ کتابیں جنکے بغیر کوئی لائبریری مکمل نہیں ہو سکتی!

گرداب
مصنفہ احمد ندیم قاسمی۔

گرداب میں ندیم اپنے آپ کو ایک نئے اور نرالے رنگ میں پیش کر رہا ہے۔ ان افسانوں میں اس نے پربتوں اور میدانوں کی کھلی دنیا سے نکل کر موجودہ پرشور تہذیب سے گونجتے ہوئے شہر کی زندگی کا جائزہ لیا ہے۔ ندیم کی انفرادی خصوصیات، اچھوتی فن کاری اور رسیلی زبان کی جھلکیاں آپنے اسکی نظموں، قطعوں، اور دیہاتی افسانوں میں دیکھی ہونگی۔ اب ہندوستان کے اس جوان فکر ادیب کو نئے روپ میں دیکھئے۔ قیمت تین روپئے بارہ آنے مجلد۔ بہترین سہ رنگا گرد پوش۔

رنگ محل
از حضرت ساغر نظامی

رنگ محل ساغر کی رومانی نظموں، غزلوں اور گیتوں کا نیا مجموعہ ہے۔ شعر و حکمت کا موثر امتزاج رومانیت و واقعیت کا دلنواز مرکب، انسانی ذہن و روح کیلئے فکر و نشاط کا جدید پیمانہ مجلد رنگین گرد پوش عاعہ/

زندگی کے نئے زاویئے
از رئیس احمد جعفری

یہ وہ افسانے ہیں جو انسانی کردار، انسانی ذہنیت، انسانی نفسیات، اور انسانی سرشت کا نیا رخ پیش کرتے ہیں۔ یہ افسانے نہیں ہیں بلکہ زندگی کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ قیمت مجلد تین روپئے رنگین گرد پوش۔

یقین و عمل
—

موجودہ دور انتشار وبے چینی کا حل صدر جمعیۃ فلاسفہ لندن وائیکونٹ سمویل کے قلم سے حالیہ ادب میں یہ بہترین تصنیف و عدیم النظیر کتاب ہے تقریباً ساری ترقی یافتہ زبانوں میں اور سارے متمدن ممالک میں ہزارہا لتعداد میں شایع ہو چکی ہے اردو زبان میں پہلی بار یہ تحفہ پیش کیا جارہا ہے قیمت دو روپئے چار آنے مجلد رنگین گرد پوش۔

ٹیگور اور انکی شاعری
از مخدوم محی الدین ایم۔ اے عثمانیہ

ٹیگور کی شاعرانہ عظمت سے کون واقف نہیں
انکی شاعری نے بین الاقوامی مقبولیت حاصل کرلی ہے
یہ شاعر مشرق پر سب سے پہلی کتاب ہے دوسرا ایڈیشن
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

رئیس الاحرار محمد علی مرحوم از مولانا عبدالماجد دریابادی

رئیس الاحرار مرحوم کی فطری اور ذہنی صلاحیتوں
انکی علمی اور دماغی قابلیتوں، ان کے جوش عمل، انکی
ہمت بلند، وعزم راسخ، انکی متواتر اور مسلسل عملی جدوجہد
ان کے خلوص وایثار، تواضع وانکسار، انکی آزادانہ
تقریر، انکی بلند تحریر، انکے موثر دلائل اور بیان
کی تصویر ذاتی علم و تجربہ کی بناء پر ہندوستان کے
سحر نگار ادیب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے
کھینچی ہے اور اس طرح کھینچی ہے کہ کوئی خدوخال
چھوٹنے نہیں پایا۔ اس کے مطالعہ سے کسی ہندوستانی
کو محروم نہیں رہنا چاہئے۔ قیمت دو روپئے بارہ آنے

مضامین عبدالماجد دریابادی

مولانا دریابادی کے ادبی تلاطم سے کون
ناواقف ہے کہ ان کی ہر تحریر ایک سیلاب کی طرح
آتی ہے اور پڑھنے والا ایک قطرہ کی طرح اس میں
شامل ہو کر شریک سیلاب بن جاتا ہے۔ وہ اس سیلاب میں
تھپیڑے کھاتا ہے۔ موجیں اس کو اچھالتی ہیں بھنور
اس کو رقص کراتے ہیں۔ مد و جزر اس کو جلترنگ
سناتے ہیں۔ اور وہ انکی تمام کیفیات میں اس طرح
گم ہو جاتا ہے کہ نہ قطرہ بن کر فنا ہونا یاد رہتا ہے نہ
حباب بن کر اٹھنے کا اسے ہوش رہتا ہے۔ یہاں تک
کہ سیلاب گذر جاتا ہے اور وہ یکایک چونک کر اپنے کو
محض ایک قطرہ پاتا ہے۔ سیلاب مزید کے لئے بیقرار،
طغیان نو کا امیدوار' یہ شوکت تھانوی کی رائے ہے
اس سے آپ اندازہ کر لیجئے۔ یہ مولانا کے منتخب
ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ قیمت تین روپئے بارہ آنے

مردوں کی مسیحائی (مقالات سیرت کا مجموعہ)

حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے
عشق و محبت نبی صلعم میں ڈوب کر لکھے ہوئے مقالات
کا مجموعہ۔ اعلیٰ ترین کاغذ۔ قیمت تین روپیے چار آنے
مجلد رنگین گرد پوش۔

نغمات ماہر از حضرت ماہر القادری

جوانی کی مسکراہٹیں۔ دوشیزگی کی انگڑائیاں
حسن کے سدا بہار پھول۔ قوم وملت کا دھڑکتا ہوا
دل، آزادی کی مضطرب روح، زندگی کی تفسیر
پاکیزہ زبان، بلند افکار، اچھوتا تخیل، عدیم النظیر
انداز بیان اور وہ سب کچھ جسے شعر و ادب کی
روح کہہ سکتے ہیں۔ قیمت تین روپئے مجلد رنگین
گرد پوش۔

محسوسات ماہر از حضرت ماہر القادری

جذبات کے شعلے، حسن وجمال کے پھول،

محبت کے نغمے اور کوثر میں ڈھلی ہوئی زبان، تڑپتی ہوئی روحوں کے لئے سامان تسکین سوتے ہوؤں کے لئے تیر ونشتر، کیف آور نظموں اور وجد آفریں غزلوں کا مجموعہ (دوسرا ایڈیشن)

قیمت دو روپیے بارہ آنے

ستیا جاپان

از علی امام بلگرامی ایم اے

قیمت دس آنے

جنگ اور روپیہ

از امتیاز حسین خاں بی کام

قیمت دس آنے (۱۰/)

اقبال کا تصور زمان و مکان

از ڈاکٹر رضی الدین

قیمت بارہ آنے (۱۲/)

جناح کے خطوط اقبالؒ کے نام

قیمت پانچ آنے (۵/)

ادارہ اشاعت اردو عابد روڈ - حیدرآباد (دکن)